بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

ولقد آتینٰک سبعا من المثانی والقرآن العظیم

آؤ عیسائیو!! ادھر آؤ!!!
نورِ حق دیکھو راہ حق پاؤ
جسقدر خوبیاں ہیں قرآں میں
کہیں انجیل میں تو دکھلاؤ

رسالہ

فتوحات الٰہیہ

مصنّفہ

ابو العطاء مولٰینا مولوی اللہ دتّا صاحب جالندہری مولویفاضل

جسے

ملک فضل حسینؓ منیجر و کنزرویٹر بکڈپو تالیف و اشاعت قادیان

نے شائع کیا

دسمبر ۱۹۳۲ء

تعداد طبع ۱۱۰۰

بار اول

عنوان

میں رسالہ "فتوحات الہیّہ" کو
سیدنا حضرت عارف اسرارِ قرآنی قدوۃ السالکین
حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح ثانی ایّدہ اللہ بنصرہ العزیز
کے اسمِ گرامی سے مُعَنْوَن کرنے کا فخر
حاصل کرتا ہوں

ع گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

ابو العطاء الجالندھری

کتبہ قاضی احمد محمد خوشنویس قادیان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

دیباچہ

رسالہ "فتوحاتِ الٰہیہ" سورہ فاتحہ کی تفسیر اور سورۂ فاتحہ پر آریہ اور عیسائی صاحبان کے اعتراضات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ اس رسالہ کی اصل وجہ تصنیف تو پادری ایس۔ ایم پال صاحب کی کتاب "سلطان التفاسیر سورۂ فاتحہ" ہے۔ لیکن ان کے علاوہ پنڈت لیکھرام اور پنڈت درشنانند صاحبان کے اعتراضات کا بھی مکمل جواب درج کیا گیا ہے۔ جواب کے متعلق میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ آپ کے سامنے موجود ہے۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں۔ کہ نوعیت اعتراض کی جدت کی وجہ سے جواب میں بعض نئی معلومات ضرور رہیں۔

ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر جب جزیرۂ عرب میں نورِ خدا کا ظہور ہوا۔ اور کفر و شرک کی تاریکیوں کو دور کرنے کے لئے "ابدی شریعت" قرآن پاک کا نزول ہوا۔ تو ظلمت سے پیار کرنے والوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ اور جنھوں نے ذرا تدبر کیا۔ انہیں قرآن مجید انسانی طاقتوں سے بالا نظر آیا۔ وہ ایک طرف حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو محض امی، دنیا کے علوم سے کورا دیکھتے۔ اور دوسری طرف قرآن کریم کے اندازِ بیان اور اعجازی شان پر نگاہ کرتے تو حیران و ششدر رہ جاتے۔ سعادت مند لوگ سرِ تسلیم خم کر دیتے اور اس شیریں چشمہ سے

سیراب ہوتے۔ لیکن شقاوت ازلی کے حصہ دار اس خیرہ کن نور کو انسانی بناوٹ قرار دیتے رہے۔ اور جب اس جلیل القدر کلام کو آنحضرت صلعم کی طرف منسوب نہ کر سکے۔ تو اسے دوسرے لوگوں سے سیکھا ہوا قرار دیا۔

قرآن مجید کی اس تحدی نے کہ تم اور تمہارے مددگار مل کر اس کی نظیر نہیں لا سکتے (بقرہ) ساری دنیا کے لوگ اس کی مثل بنانے سے عاجز ہیں۔ (بنی اسرائیل) مشرکین عرب کے اعتراض کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا۔ چنانچہ انہیں بھی اس کا احساس ہوا ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ مکی زندگی میں تو یہ اعتراض بار بار پیش ہوا ہے۔ اور مکی سورتوں میں ہی اس کا ذکر آیا ہے۔ لیکن بعد ازاں وہ اس اعتراض سے خاموش نظر آتے ہیں۔ اب وہ مفتری۔ شاعر اور مجنون تو کہے جا رہے ہیں۔ لیکن اس اعتراض کا ذکر نہیں کرتے۔

دشمنانِ اسلام آریہ پنڈتوں اور عیسائی پادریوں نے اس فرسودہ اعتراض کو ایک نیا رنگ دیا۔ اور اس کا نشانہ سورۃ فاتحہ کو بنایا۔ اور وہ یوں کہ سورۃ فاتحہ ویدوں سے یا بائبل سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ سورہ فاتحہ خدائے برتر کا کلام ہے۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا افترا نہیں۔ ہاں وہ وید کی رُوح تھی یا بائبل کی جان۔ جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کا متن بنا لیا۔ اس اعتراض کا تفصیلی جواب آئندہ اوراق میں موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مشیت الٰہی نے اس زمانہ کو فاتحہ کے انوار و برکات کے ظہور کا زمانہ بنایا ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فاتحہ کے خزانوں کو دنیا کے سامنے کھول دیا۔ اور ان موتیوں کی ایک بارش رحمت نازل ہو گئی۔ ہر فطرت اس بارش سے حصہ لے کر اپنی استعداد کے اظہار میں منہمک ہے۔ جس کا نقطۂ مرکزی سورہ فاتحہ ہے ۵

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

قرآن مجید نے مشرکین عرب کے مشار الیہ اعتراض کے جو جواب دئے ہیں مناسب ہے۔ کہ دیباچہ میں ان کا ذکر کر دیا جاوے۔ سورۃ النحل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ولقد نعلم انھم یقولون انما یعلمہ بشر۔ لسان الذی یلحدون الیہ اعجمی وھذا لسان عربی مبین (رغ) ہمیں معلوم ہے کہ وہ کہیں گے کہ اس کو انسان سکھاتا ہے۔ مگر جس کی نسبت یہ کہ رہے ہیں۔ اس کی زبان عجمی ہے۔ اور یہ تو فصیح ترین عربی ہے۔

سورۃ الدخان میں ان لوگوں کے بوقت عذاب زاری کرنے پر فرمایا۔ انّی لھم الذکری وقد جاءھم رسول مبین ثم تولوا عنہ وقالوا معلّم مجنون (ع ۱) یہ لوگ کہاں نصیحت حاصل کریں گے۔ جبکہ ان کے پاس محمد مصطفیٰ صلعم جیسا رسول مبین آیا۔ مگر انہوں نے اعراض کیا۔ اور اُسے سکھایا ہوا اور پاگل تبلایا۔ گویا آنحضرت کی پیشگوئی کے مطابق عذاب آجانا ان کے دعوی کی تردید تھی:۔

سورہ عنکبوت میں فرمایا۔ وما کنت تتلوا من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک اذاً لارتاب المبطلون بل ھو اٰیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم وما یجحد باٰیاتنا الا الظلمون (رع ۵) تُو اس قرآن سے پہلے نہ کتاب پڑھتا اور نہ لکھا کرتا تھا۔ تاکہ باطل پرست شک کر سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن تو اہل علم کے سینوں میں کھلی کھلی آیات ہیں۔ اور ہماری آیات کا صرف ظالم ہی انکار کرتے ہیں۔

سورہ فرقان میں فرمایا وقالوا اساطیر الاوّلین اکتتبھا فھی تملی علیہ بکرۃ واصیلاً قل انزلہ الذی یعلم السرّ فی السموٰت والارض

انہ کان غفوراً رحیماً۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ پہلوں کی کہانیاں ہیں جو اس نے لکھ رکھی ہیں۔ اور وہی اس پہ صبح و شام پڑھی جاتی ہیں۔ اے رسول! تو کہدے کہ یہ قرآن تو اس ذات نے اتارا جو آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہے۔ اور غفور رحیم ہے (ع ۱) یعنی یہ کہانیاں نہیں پیشگوئیاں ہیں۔ جو خدائے علّام الغیوب کا کلام ہیں۔ قرآن پاک کے ان جوابات نے باطل کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اور حق غالب ہُوا۔

اخیر پر میں اس امر کا بھی اظہار کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ عیسائیوں کے اس غوغا کی تردید کے لئے کہ قرآن کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس کی ساری تعلیمات بائبل سے ماخوذ ہیں۔ میں نے ارادہ کیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحم سے مستقبل قریب میں ایک جامع کتاب بائبل اور قرآن مجید کے موازنہ پر تحریر کروں۔ وباللہ التوفیق۔ اے خدا تو اس رسالہ کو قبول فرما اور آئندہ کے لئے بیش از بیش توفیق عطا فرما۔ تیری توفیق کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ آمین ثم آمین
میں اپنے احباب سے درخواست دعا پر اس دیباچہ کو ختم کرتا ہوں۔

حیفا فلسطین
۲۴ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء

خاکسار ناچیز خادم
ابو العطاء

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

باب اوّل

سورۂ فاتحہ کی شان بلند

اسلامی و غیر اسلامی شہادتیں

سورہ فاتحہ ایک نہایت مختصر سورت ہے۔ صرف سات آیات کا مجموعہ ہے۔ مگر اپنے معانی و مطالب، حقائق و دقائق، رموز و اسرار اور فطری و طبعی ترتیب کے لحاظ سے ایک بحر بے پایاں اور نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے۔ قریباً چودہ سو برس سے طالبان مولیٰ اور عشاقِ حق اس نور سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ علماء، ادباء۔ نحاۃ، فلاسفر، مفسرین اور برگزیدگان حضرت احدیت اس کے انوار و برکات، نکات و معارف، دُرر و جواہر سے دامن بھر رہے ہیں۔ لیکن زمانہ کی طوالت، طالبوں کی کثرت اور محققین کی نکتہ سنجی و باریک بینی اسے دھندلا کرنے کی بجائے اور بھی روشن کر رہی ہے۔ قلوب کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے وہ آب حیات کا شیریں چشمہ ہے۔ جس سے پیاسے سیراب ہوتے اور مردے زندگی پاتے ہیں۔ وہ روحانی پانی کا بحر بے کنار ہے۔ جس سے صاحب دل

مستفید ہو رہے ہیں۔

سورہ فاتحہ قرآن مجید جیسی بے مثل، بے نظیر، کامل اور افصح ترین الہامی کتاب کا خلاصہ ہے۔ اس کے تفصیلی بیانات کا متن ہے۔ اس لئے وید، زبور، تورات، اور انجیل میں انفرادی یا مجموعی حیثیت سے اس کی نظیر تلاش کرنا سعیٔ لاحاصل ہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے۔ کہ قرآن پاک کی آیات بیّنہ میں سے بھی سورۂ فاتحہ کو خاص شان حاصل ہے۔ اور اس کی مانند کوئی دوسری سورت نہیں ہے۔ یہ سورت کیا ہے۔ بالکل اچھوتے اور نادر موتیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا حسن عالمتاب اب اغیار کو بھی اس کی مدح سرائی پر مجبور کر رہا ہے۔ اور آریہ و عیسائی بھی سورۂ فاتحہ کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ جیسا کہ آئندہ صفحات سے بخوبی ظاہر ہو جائیگا۔ صرف یہ ہے۔ کہ سورہ فاتحہ کو ہمارے اس زمانہ سے جو آخری زمانہ ہے۔ ایک خاص تعلق ہے۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت کو اس صورت کے ساتھ خصوصی نسبت حاصل ہے۔ چنانچہ اس میں مسیح موعود کی آمد کی پیشگوئی بھی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس سورت کی الہامی تفسیر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو سکھلائی۔ اور یہ ایک غیر معمولی نشان تھا۔ جس میں آپ کے مخالف مغلوب ہوئے۔ اسی مقدس وجود کے انفاس طیبہ کا اثر ہے۔ کہ آج عیسائی، معاند عیسائی اور آریہ، اشد مخالف آریہ بھی کسی نہ کسی رنگ میں سورہ فاتحہ کی تعریف کر رہے ہیں۔ فللہ الحمد۔

اس سورۂ کے متعدد اسماء ہیں۔ امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں بارہ [۱۲] نام ذکر کئے ہیں۔ زیادہ تر سورۃ الفاتحہ، سورۃ الحمد، ام القرآن اور السبع المثانی مشہور نام ہیں۔ اور ہر ایک نام اس سورت کی عظمت اور جلالت شان پر دلالت کر رہا ہے۔

سُورۂ فاتحہ اور قرآن مجید

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

(۱) ولقد اٰتینٰک سبعًا من المثانی والقرآن العظیم۔ اے رسول ہم نے خصوصیت سے تجھکو سبع المثانی اور القرآن العظیم عطا کیا ہے۔ گویا سورۃ فاتحہ سات آیات ہیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں۔ اور قرآن مجید کا خلاصہ بھی۔ (الحجر ع ۶)

(۲) انا جعلناہ قرآنًا عربیًا لعلکم تعقلون وانہ فی ام الکتاب لدینا لعلی حکیم (زخرف ع ۱) یہ قرآن مجید عربی تمہیں عقل و حکمت سکھانے آیا ہے۔ اور یہ ہمارے پاس یا ہمارے بیان کے مطابق سورۃ الفاتحہ (ام الکتاب) میں بلند و باحکمت ہے۔

سُورۂ فاتحہ اور آنحضرت صلعم

سورۂ فاتحہ کے فضائل کے متعلق بکثرت احادیث آئی ہیں۔ بغرض اختصار صرف چار حدیثیں درج کرتا ہوں۔ (۱) ابو سعید بن المعلی سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا:-

"لاعلمنک سورۃ ھی اعظم السور فی القرآن قبل ان تخرج المسجد ثم اخذ بیدی فلما اراد ان یخرج قلت لہ الم تقل لاعلمنک سورۃ ھی اعظم سورۃ فی القرآن قال الحمد للہ رب العٰلمین ھی السبع المثانی والقرآن العظیم الذی اوتیتہٗ"

(بخاری کتاب التفسیر)

کہ تیرے مسجد سے نکلنے سے پیشتر میں تجھے وہ سورۃ سکھاؤنگا۔ جو قرآن مجید کی سورتوں میں سب سے عظیم الشان ہے۔ پھر حضور علیہ السلام نے میرا ہاتھ

پکڑا۔ جب مسجد سے جانے لگے۔ تو میں نے عرض کیا۔ کہ حضور نے عظیم ترین سورت سکھانے کے متعلق فرمایا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ کہ وہ سورۃ فاتحہ ہے۔ یہی السبع المثانی اور القرآن العظیم ہے۔ جو مجھے دیا گیا۔

(۲) حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"والذی نفسی بیدہٖ ما انزلت فی التوراۃ ولا فی الانجیل ولا فی الزبور ولا فی القراٰن مثلھا وانھا سبع المثانی والقراٰن العظیم الذی اعطیتہ" (ترمذی ابواب فضائل القرآن)

اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ کہ سورہ فاتحہ کی مانند نہ توراۃ انجیل اور زبور میں اور نہ ہی قرآن مجید میں کوئی سورۃ نازل ہوئی ہے یہی السبع المثانی اور القرآن العظیم ہے۔ جو مجھے دیا گیا ہے۔

(۳) حضرت انس سے روایت ہے۔ کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:۔

"ان اللہ اعطانی فیما منّ بہ علی انی اعطیتک فاتحۃ الکتاب وھی من کنوز عرشی"

کہ اللہ تعالیٰ نے جو بخشیش مجھ پر فرمائیں اور ان کا ذکر بھی فرمایا۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے کہا۔ کہ میں نے تجھے فاتحۃ الکتاب (سورہ فاتحہ) دی ہے۔ اور یہ میرے عرش کے خزانوں اور اسرار میں سے ہے"

(اتقان للسیوطی جلد ا صفحہ ۳۸ بحوالہ شعب الایمان)

(۴) حضرت ابن عباس سے امام مسلم نے روایت کی ہے۔ کہ آنحضرت صلعم کے پاس فرشتہ آیا اور کہا۔ کہ ان دو نوروں پر بشارت ہو۔ جو آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دئے گئے۔ اور وہ سورہ فاتحہ اور سورہ بقر کا خاتمہ ہے۔

(اتقان جلد ا صفحہ ۳۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس سورت کے متعلق خاص فخر تھا جس کا حضور نے بسا اوقات اظہار فرمایا ہے۔

سورۂ فاتحہ اور حضرت مسیح موعودؑ

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اس سورت کا اس زمانہ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ذات سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ حضور نے اس سورۃ کے حقائق و معارف کا ایک دریا بہا دیا ہے۔ حضرت مولانا نور الدین اعظم رضی اللہ عنہ جیسا عاشق قرآن بھی فرماتا ہے۔ کہ:-

"حضرت صاحب نے تین مبسوط تفسیریں اس سورۂ شریف پر لکھی ہیں جن میں سے ایک اردو میں ہے۔ اور کتاب براہین احمدیہ میں ہے اور دو عربی زبان میں ہیں۔ ایک کا نام کرامات الصادقین ہے۔ اور دوسری کا نام اعجاز المسیح ہے۔ وہ بڑا خوش قسمت[1] ہو گا جسکو خدا تعالیٰ توفیق دے۔ کہ وہ کم از کم ان تین تفاسیر کا مطالعہ کرے۔ میں اس امر کی طرف تم کو خاص توجہ دلاتا ہوں۔ جو عربی نہیں جانتے۔ وہ کم از کم اردو کو پڑھ لیں۔" (درس القرآن کے نوٹ)

بنا بریں ہم جملہ مفسرین، بزرگانِ اسلام اور علماء کرام کے بیانات سے بہ نیت اختصار قطع نظر کر کے سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ایک قول درجِ ذیل کرتے ہیں۔ حضور تحریر فرماتے ہیں:-

"انی اری ان فوائد ھذہ السورۃ الکریمۃ ونفائسھا لا تعدد لا تحصی ولیس فی وسع الانسان ان یحصیھا وان انفد عمرا فی ھذا الھوی ... وانھا سورۃ قوی الصول علی الکفرۃ سریع الاثر علی الافئدۃ السلیمۃ ومن تاملھا تامل

[1] الحمد للہ کہ اس نے مجھے ان تینوں کے مطالعہ کی توفیق بخشی۔ ابو العطاء

المنتقد و دانا ھایفک منیرکا لمصباح المتقد الفاھا نور الابصار و مفتاح الاسرار" (اعجاز المسیح صفحہ ۲۲)

ترجمہ - میں دیکھتا ہوں - کہ اس سورۃ کریمہ کے فوائد، عجائبات اور حقائق بے شمار ہیں - اور کسی انسان سے ان کا احاطہ کرنا ممکن نہیں - اگرچہ وہ اس خواہش کے لئے عمر خرچ کردے - . . . . . یہ سورۃ منکرین پر زبردست حملہ کرنے والی اور سلیم دلوں پر جلد تر اثر کرنے والی ہے - جو شخص اسے انتقادی نظر سے، گہرے اور روشن فکر سے دیکھیگا - وہ یقیناً اس سورۃ کو آنکھوں کا نور اور اسرار کی کلید پائیگا -

اسلام میں سورہ فاتحہ کی عملی حیثیت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور جملہ مسلمانانِ عالم سورہ فاتحہ کو نماز کی ہر ایک رکعت میں پڑھتے رہے اور پڑھتے ہیں - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب" (ترمذی کتاب الصلوٰۃ) اس شخص کی نماز ناقص ہے، جو سورہ فاتحہ نہ پڑھے -

غرض سورۃ فاتحہ قرآن مجید کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی سورت ہے، ایک مسلمان کم از کم تیس ۳۲ مرتبہ ضرور اس سورۃ کو ہر روز پڑھتا ہے - اس جگہ یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے - کہ قرآن پاک دنیا بھر کی مذہبی کتابوں میں سے سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے - بائبل کے ترجمے کر کے مفت تقسیم کر دینا اور بات ہے - اور اس کی تلاوت کرنا امر دیگر - قرآن مجید کا بکثرت پڑھا جانا دراصل اس پیشگوئی کا پورا ہونا ہے - جو لفظ "قرآن" (بار بار اور بکثرت پڑھا جانیوالا کلام) میں موجود تھی - قرآن پاک کی اس خوبی کا اعتراف اہل مغرب بھی کر رہے ہیں -

مشہور جرمن مستشرق پروفیسر نولڈیک لکھتے ہیں :-

"And since the use of the Koran

in Public Worship, in schools and otherwise, in much more extensive than, for Excample, the reading of the Bible in most Chirstian countries, it hes been truly described as the most widely read Book in Existence."

(انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جلد ۱۶ صفحہ ۵۹۷)

یعنی قرآن مجید کی تلاوت عام عبادت میں، مدرسوں میں اور دوسرے طریق سے مقابلتہً بہت زیادہ ہے۔ اور مسیحی ممالک میں بائبل کی قرأت کا قرآن مجید کی تلاوت سے اگر مقابلہ کیا جاوے۔ تو صاف کہنا پڑتا ہے۔ کہ قرآن مجید دنیا بھر میں وسیع ترین حلقہ میں اور سب سے زیادہ پڑھی جانیوالی کتاب ہے۔

ناظرین کرام! اس سے آپ سورت فاتحہ کی عملی حیثیت کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ قرآن مجید تمام کتابوں سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ اور سورہ فاتحہ باقی قرآن مجید کی نسبت سے بھی زیادہ پڑھی جاتی ہے۔

انجیلی شہادت — اور — سُورہ فاتحہ

بائبل میں عموماً قرآن مجید کے متعلق پیشگوئیاں موجود ہیں۔ مگر سورہ فاتحہ کے متعلق خصوصیت سے بھی ذکر پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مکاشفات یوحنا میں جو بائبل کا آخری صحیفہ سمجھا جاتا ہے۔ اور یوحنا ملہم کے آئندہ ہونیوالے واقعات سے متعلقہ کشوف ورؤیا کا مجموعہ ہے۔ صاف طور پر لکھا ہے:-

(الف) "میں نے ایک اور زور آور فرشتے کو بادل اوڑھے ہوئے آسمان

سے اترتے دیکھا۔ اس کے سر پر دھنک تھی۔ اور اس کا چہرہ آفتاب کی مانند تھا۔ اور اس کے پاؤں آگ کے ستونوں کی مانند اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کھلی ہوئی کتاب تھی۔ اس نے اپنا داہنا پاؤں تو سمندر پر رکھا اور بایاں خشکی پر۔"

(باب ۱۰۔ آیت ۱-۲)

(ب) "جو تخت پر بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے دہنے ہاتھ میں ایک کتاب دیکھی جو اندر سے اور باہر سے لکھی ہوئی تھی۔ اور اُسے سات مُہریں لگا کر بند کیا گیا تھا۔" (۵ مکاشفات)

ہر دو عبارتیں نہایت واضح طور پر آنحضرت صلعم، قرآن مجید اور خصوصیت سے سورۂ فاتحہ کی خبر دے رہی ہیں۔ "ایک چھوٹی سی کھلی ہوئی کتاب" کا ترجمہ عربی بائیل میں "سفر صغیر مفتوح" کیا گیا ہے۔ عبرانی کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

"ספר קטן פתוח"

"سیفیر قطن فتوحہ"

گویا بالفاظ دیگر فاتحہ کا نام بطور پیشگوئی بائبل میں موجود ہے۔

سورۂ فاتحہ اور سوامی درشنانند جی

پنڈت درشنانند جی سورہ فاتحہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"وہ سورت جس پر اہل قرآن ہی نہیں بلکہ مصنّف قرآن کو بھی ناز ہے۔ جو درحقیقت قرآن کی جان ہے۔ جس سے بہتر تعلیم قرآن میں پائی نہیں جاتی۔" (ٹریکٹ "قرآن کی جان وید کا ایک منتر ہے" صفحہ ۵)

گویا پنڈت صاحب کو بھی تسلیم ہے۔ کہ سورۂ فاتحہ قرآن مجید کا خلاصہ اور بہترین تعلیم ہے۔

سورۂ فاتحہ۔ اور پروفیسر نولڈیک

جرمن مستشرق نولڈیک انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کے نویں اڈیشن میں سورۂ فاتحہ کے ذکر پر لکھتے ہیں :۔

"یہ مسلمانوں کی الہامی دعا ہے۔ جو خدا کے حضور کی جاتی ہے۔ اور یہ مسلمہ اور ناقابل تردید امر ہے۔ کہ قرآن مجید کا خلاصہ ہے۔ اس سورت کے جو سورۃ الفاتحہ کے نام سے موسوم ہے حسب ذیل الفاظ ہیں۔ (الفاظ کے بعد) یہ اس قدر واضح اور سادہ جذبات ہیں۔ کہ تشریح کی ضرورت نہیں۔ آج تک یہ ایک بامعنی اور پُرمغز دعا ہے۔" (جلد ۱۶ صفحہ ۶۰۳)

سورۂ فاتحہ اور پادری ایس ایم پال صاحب

پادری ایس ایم پال صاحب جن کے رسالہ "سلطان التفاسیر" کا اہم خصوصیت ہے اس کتاب میں جواب لکھ رہے ہیں وہ بھی اپنے رسالہ کے اخیر پر "سورۂ فاتحہ کی شان" کے عنوان کے ماتحت لکھتے ہیں:۔

"سورۂ فاتحہ اپنے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے نہایت شاندار سورۃ ہے۔ اس کے ہر جملہ سے خدا کی خدائی، اسکی عظمت اور برتری، اس کے رحم اور فضل کی عالم گستری، اس کے بندوں کی طرف سے عجز و نیازمندی، اطاعت و فرمانبرداری، اور حقیقی دعا و التجا ظاہر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ویری صاحب نے اپنی انگریزی تفسیر القرآن میں کیا ہی خوب لکھا ہے کہ دو سورۂ فاتحہ کی اس کے حقیقی مقصد کے لحاظ سے کوئی مسیحی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ اول سے آخر تک ایک مخلصانہ دعا ہے جسکو مسیحانہ طور

پرداکیا گیا ہے۔ ہر ایک شخص اس کے جواب میں آمین کہہ سکتا ہے "میں کہتا ہوں کہ صرف آمین نہیں۔ بلکہ اس کو ورد کر سکتا ہے" (ص۳۱)

ناظرین کرام! ان تمام بیانات کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ سورت فاتحہ پر نہ صرف اہل اسلام کو ہی ناز ہے۔ بلکہ غیر مسلم، اشد دشمن، مشرقی و مغربی بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ گویا سورۃ فاتحہ کو جو قبولیت اپنوں و بیگانوں میں حاصل ہے۔ وہ دنیا کی کسی کتاب کو حاصل نہیں۔ وہ بے نظیر کلام ہے۔ اور اسے بے مثال اور عالمگیر قبولیت حاصل ہے۔ ؎

بہار جاوداں پیدا ہے اس کی ہر عبارت میں
نہ وہ خوبی چمن میں ہے نہ اس سا کوئی بستاں ہے

باب دوم

سُورۃ فاتحہ کا مأخذ اور عیسائی آریہ مصنف!

سورۃ فاتحہ کی رعنائی و دلربائی کے پیش نظر یہ بات ہرگز اچنبھی نہ معلوم ہوگی۔ کہ سالہا سال تک معاندین اسلام اس درِ ناسفتہ کو عیب دار قرار دینے کے بعد اب اس حد تک گرویدہ ہو جائیں۔ کہ سورۃ فاتحہ کو پورے طور پر اپنانے لگ جائیں۔ گذشتہ باب میں بعض غیر مسلموں کی آراء کا بھی ذکر ہو چکا ہے۔ آریوں اور عیسائیوں نے موجودہ زمانہ میں سورۃ فاتحہ کی تعریف کی ہے

مگر اس کے لئے ایک نئی آڑ پیدا کر کے ۔ اور وہ یہ کہ در اصل سورۂ فاتحہ وید یا بائبل سے ماخوذ ہے ۔ گویا اس اضطراری تعریف کے ساتھ اعتراض کا رخ بدل دیا گیا ہے ۔

آریوں میں سے پنڈت لیکھرام ۔ پنڈت دھرم بھکشو اور سوامی درشنانند صاحبان نے خصوصیت سے اس بات پر زور دیا ہے ۔ اول الذکر نے کتاب کلیات آریہ مسافر میں ، ثانی الذکر نے اپنے رسالہ "آریہ مسافر" میں اور موخر الذکر نے اپنے ٹریکٹ میں قریبًا ایک ہی مضمون اور ایک ہی منتر بیان کیا ہے ۔ سوامی صاحب مذکور نے سورۂ فاتحہ کے ماخذ کی ویدوں میں سے نشاندہی کرنے کے علاوہ یہ بھی تحریر کیا ہے :-

"جس قدر قرآن شریف میں اچھی باتیں ہیں وہ سب وید سے لی ہوئی ہیں" (ٹریکٹ صـ؁)

یہ دعویٰ در اصل عیسائیوں کے اس دعویٰ کا ردّ عمل ہے کہ "قرآن کی تمام خوبیاں بائبل سے ماخوذ ہیں" یا یوں کہو کہ قرآن پاک کے بیان "تشابہت قلوبھم" کی تصدیق ہے ۔ لیکن چونکہ صاحب موصوف نے اتنے بڑے دعویٰ کو شرمندۂ دلیل بنانے کی تکلیف نہیں فرمائی ۔ اور محض عیسائی دوستوں کی عادت کی نقل کی ہے ۔ اسلئے یہ قول شائستہ اعتنا نہیں ہاں سورۂ فاتحہ کے ماخذ پر آریہ اور عیسائی اصحاب نے بزعم خود احاطہ کر لیا ہے ۔ اس لئے ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں ۔ کہ ان کے بیانات کو من و عن درج ذیل کر دیں ۔

پنڈت لیکھرام جی لکھتے ہیں :-

"سوامی شنکر اچاریہ کے زمانہ سے جب شیومت کا آغاز ہوا ۔

اور اس کے اپدیشک سیر و سیاحت اور یاترا کے واسطے مکہ وغیرہ تیرتھوں میں جانے لگے۔ تو انہوں نے وہ شنکر سوامی کا مشہور وید منتر کا ٹکڑہ جس پر اپ نشدوں میں خوب بحث کیگئی ہے جسے عام طور پر روز ورد کرتے تھے۔ لوگوں کو اپدیش کیا۔ اور انہیں سنیاسیوں کی زبانی محمدؐ صاحب نے جو مکہ کے مندر کے پوجاری کے فرزند تھے سنا۔ تو جس طرح بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وغیرہ بہت سی آیات سلمانؓ[1] پارسی وغیرہ کی زبانی سن سنا کر قرآن میں درج فرمائیں۔ اسی طرح

"اگنے نیہ سوپتھا رائیے اسمان وشوانی دیو ویُو نانی وددان !

یُویودی اسمج جُھوران مینو بھُو یشٹھام تے نم اُکتم ردہیم ۱۱ "

اس کا ترجمہ بجنسہٖ یہ ہے۔ الحمد للہ رب العٰلمین ایاک نعبد وایاک نستعین اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیرا المغضوب علیھم ولا الضالین

ترجمہ:- ہے سب کو جاننے ہارے پرماتمن آپ ہم کو سرشٹ مارگ یعنی سمپورن پر گیانوں کو پراپت کرائیے۔ اور جو پاپ آچرن روپا بُرے مارگ ہیں۔ ان سے ہم کو دُور کیجئے۔ اس لئے ہم لوگ

---

[1] سلمان فارسی تو مدینہ منورہ میں داخل اسلام ہوئے ہیں۔ اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم مکی سورتوں کے ابتدا میں نازل ہوئی ہے اور نہیں تو اس امر کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سورۃ نمل مکی ہے۔ اسمیں حضرت سلیمانؑ کے خط کا ذکر یوں ہے۔ "انہ من سلیمان وانہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الا تعلوا علی واتونی مسلمین۔" (ع ۲) پس اس آیت کے سلمان فارسی سے سیکھنے کا قصہ بھی افسانہ سے زیادہ نہیں۔ ابو العطار

سیمنتا پور بکس آپ کی ستتی کرتے ہیں کہ آپ ہم کو پوتر کریں۔"
(کلیات آریہ مسافر صفحہ ٦٣٢)

سوامی درشنانند جی اپنے ٹریکٹ موسومہ "قرآن کی جان وید کا ایک منتر ہے" میں لکھتے ہیں۔

"سورۃ فاتحہ سوائے چند لفظوں کے جو مصنف قرآن نے اپنی طرف سے ملائے۔ باقی حرف بحرف اس منتر کا ترجمہ ہے۔"

اس عجیب و غریب دعوی کا ثبوت کیا ہے؟ فرماتے ہیں:-

"بہت سے لوگ حیران ہوں گے۔ کہ وید کے یہ ٹکڑے محمد صاحب تک کس طرح پہنچے۔ کیونکہ نہ تو محمد صاحب ہندوستان میں آئے اور نہ ہی سنسکرت زبان سے وہ واقف تھے سنسکرت ہی کیا سوائے اپنی زبان مادری عربی کے دوسری زبان (بالعموم) سے محض ناواقف تھے۔ اور نہ ہی کوئی سنسکرت کا عالم اس زمانہ میں عرب میں گیا تھا پس یہ کس طرح تسلیم کیا جاوے۔ کہ محمد صاحب نے یہ سورت اور ٹکڑے ویدکی تعلیم سے لئے۔ ایسے لوگوں کو محمد صاحب کی سوانح عمری اور پورانی تواریخوں کو غور سے پڑھنا چاہیئے۔ جس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ محمد صاحب خدیجہ کے گماشتہ ہو کر اکثر غیر ملکوں میں تجارت کے واسطے گئے۔ خاص کر شام میں۔ چونکہ شام اس زمانہ میں بہت بڑی تجارت گاہ تھی۔ جہاں ہر ملک کے لوگ تجارت کے واسطے آتے جاتے تھے۔ اور ہندوستان کے اپدیشک کل دنیا میں گھومتے تھے۔ خاص کر شنکر اچاریہ کے چیلے تو دنیا میں سے بدھ مذہب کی بنیاد اکھاڑتے اور توحید ایزدی

پھیلاتے گھوم رہے تھے۔ انہیں کے اپدیشکوں سے ملک شام میں محمد صاحب نے یہ خیالات حاصل کئے" صلا

پادری ایس ایم پال صاحب لکھتے ہیں:۔

(۱) فی الحقیقت سورۂ فاتحہ قرآن کا کوئی جزو یا حصہ نہیں ہے۔ بلکہ آنحضرت کے طویل زمانہ کے انتخابات کا ایک نہایت عمدہ مجموعہ ہے...... آنحضرت نے اس انتخاب کو مکہ سے شروع کیا۔ اور مدینہ میں جاکر ختم کیا" (سلطان التفاسیر ص۶)

(۲) یہ بائبل مقدس کے وہ جواہر ریزے ہیں۔ جن کو ایک نئے طرز اور نئے اسلوب کے ساتھ ایک ہی سلک میں پرودیا گیا ہے" (ص۲۵)

اس جگہ اگر یہ سوال ہو۔ کہ اس انتخاب کی تقریب کیونکر پیدا ہوئی اور کیفیت انتخاب کیا ہے۔ تو پادری صاحب لکھتے ہیں:۔

"آنحضرت صلعم اہل کتاب کی کتابوں کے صرف مداح نہیں تھے بلکہ ان کو منجانب اللہ رہدایۃ وموعظۃ بھی مانتے تھے امیّہ کے ان سحر افگن اور روح افزا اشعار کو سن کر آپ کو یقین ہوا ہوگا کہ ان سب کی اصل اور ماخذ کتب مقدسہ ہی ہیں۔ اس لئے بلا تاخیر کتب مقدسہ کی طرف آپ نے رجوع کیا ہوگا۔ اور انہی کتابوں میں سے دیگر قرآنی امور کی طرح الحمد کو منتخب فرمایا ہوگا" (ص۱۱)

ناظرین کرام! ان ہر سہ اقتباسات پہ ایک نظر ڈالئے اور دیکھئے۔ کہ اہل باطل کس طرح اندھیرے میں ہاتھ مار رہے ہیں* تعلیم کی خوبی کے قائل ہیں سورہ فاتحہ کی جذب آفرینی کے اقراری ہیں۔ مگر افسوس کہ اتنی سی معمولی بات نہیں سمجھ سکتے

* ناظرین غور فرماویں کہ پادری صاحب کی تحقیق کس قدر مشکوک ہے۔ کہ ان کا اپنا ضمیر بھی بار بار ہوگا استعمال کر رہا ہے۔ سچ ہے۔ بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ۔ ابو العطاء

کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسے امی انسان کو یہ سب باتیں خدا تعالیٰ نے سکھائی ہیں۔ اے تعصب! تیرا ستیاناس ہو۔ کہ تو دانا کہلانے والوں کو اندھا اور علم کے دعویداروں کو نادان بنا دیتا ہے۔

پنڈت لیکھرام، مکہ معظمہ کو ہندوستانیوں کا تیرتھ قرار دیتے ہیں۔ اور شیومت کے پیروؤں کا اس کی یاترا کے لئے جانا بیان کرتے ہیں۔ اور اپنی معروف تاریخ کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کے مندر کے پجاری کا بیٹا بتاتے ہیں۔ اور ان لیکھرامی خرافات کا سلسلہ آخر اس جگہ ختم ہوتا ہے۔ کہ ان سنیا سیوں کی زبان سے النبی الامی صلعم نے وید منتر سن کر سورۃ فاتحہ بنالی۔ گویا آپ کے نزدیک اس منتر کا علم مفروضہ سنیاسیوں کی معرفت آنحضرت کو مکہ معظمہ ہی میں ہوا مگر یہ بتانا آپ بھول گئے۔ کہ اس تعلیم وتلقین میں کون سی زبان واسطہ تھی، سنسکرت یا عربی؟ ان کے بعد پنڈت درشنا نند جی نے شام کو تجارت گاہ بنا کر اور پھر اس جگہ ہندستانی اپدیشکوں کا توحید کے پرچار کے لئے پہنچنا فرض کر کے یہ لکھا ہے۔ کہ آنحضرت صلعم نے سورۂ فاتحہ کے خیالات ملک شام میں حاصل کئے۔ آپ نے اگرچہ مکہ معظمہ کی بجائے ملک شام تبدیل کر کے لیکھرامی بیان کی تردید کر دی ہے۔ مگر تاہم اپنے مفروضہ بیان کی تائید میں یہ نہیں بتا سکے۔ کہ "ان خیالات کے حصول" میں کون سی زبان واسطہ تھی۔ عربی یا سنسکرت؟

باوری ایس ایم پال ایک مرتد مسلمان ہیں۔ اس لئے آپ نے طرز بھی نئی ہی ایجاد کی ہے۔ امیہ بن ابی الصلت کے شعر آنحضرت نے سن پائے۔ جھٹ آپ کی توجہ بائبل مقدس کی طرف مبذول ہو گئی۔ اور باوجودیکہ آپ اُمّی تھے اور بائبل کا عربی ترجمہ مکمل یا کتابی صورت میں موجود نہ تھا۔ مگر آپ نے طویل زمانہ میں بائبل کی آیات پر غور کیا۔ اور آخر الامر سات آیتوں والی سورۂ فاتحہ انتخاب کر لی ماشاءاللہ

کیا ہی مدلل بیان ہے۔

ہم آرین اور عیسائی بیانوں کی مکمل تردید بیرونی اور اندرونی شہادتوں سے اس رسالہ کے باب سوم اور باب چہارم میں لکھ رہے ہیں۔ مگر تفصیلی بیان سے پیشتر اس جگہ اتنا اشارہ کرنا ضروری ہے۔ کہ ایک آریہ اور عیسائی اصحاب کا یہ بیان خود ہی ایک دوسرے کی تردید کر رہا ہے۔ درحقیقت یہ بیانات اگر کسی بات پر دلالت کرتے ہیں تو وہ صرف یہ ہے۔ کہ سورۂ فاتحہ اس قدر بلند حقائق و معارف پر مشتمل ہے۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تک رسائی ناممکن محض ہے۔ کیونکہ یہ صرف الٰہی خزانہ کے موتی ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر آریہ صاحبان نے اسے ویدکی طرف اور مسیحی اصحاب نے بائبل کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اصل امر اور حقیقت واقعیہ یہ ہے۔ کہ یہ سورہ اور دیگر قرآنی سورتیں انسان کی ایجاد نہیں، انسانی دماغ کی شرمندۂ احسان نہیں۔ بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کا کلام اس کے پاک رسول، نبیوں کے سردار حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ کا خصوصیت سے ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ ولقد اتیناک سبعاً من المثانی والقرآن العظیم (الحجر) یقیناً ہم نے ہی تجھ پر سورہ فاتحہ نازل کی ہے اور قرآن عظیم بھی۔

الغرض سورہ فاتحہ کے ماخذ کے متعلق آریہ سماجی وید کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ عیسائی اس کا ماخذ توراۃ وانجیل کو تبلاتے ہیں۔ اور قرآن مجید اس کو خالص خدا کا بے مثل کلام تبلاتا ہے۔ جس سے توراۃ وانجیل یا وید کو کوئی نسبت نہیں سچ ہے ؎

کس سے اس نور کی ممکن ہو جہاں میں تشبیہ\
وہ تو ہر بات میں ہر وصف میں یکتا نکلا

باب سوم

آریہ سماجی دعوی کی تردید

آریہ مصنفین کے مندرجہ بالا دعوی کی تردید بیرونی واندرونی شہادت کے لحاظ سے تین طور پر ہو سکتی ہے۔ (۱) شیومت یا شنکر آچاریہ کے اُپدیشکوں کے قصہ کو فرضی ثابت کر دینے سے (۲) مذکورہ وید منتر اور سورہ فاتحہ کے درمیان موازنہ کرنے سے (۳) سورہ فاتحہ کے ذریعہ آریہ عقائد کی تردید کے اثبات سے۔ اس لئے ہم ذیل میں مختصر طور پر ہر سہ طریق سے آریہ دعوی کی تردید ذکر کرتے ہیں۔

قصہ فرضی ہے

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر واقعہ صفحاتِ تاریخ پر ثبت ہے۔ مگر اس امر کا ذکر کسی تاریخدان نے نہیں کیا۔ کہ آپ نے کسی ہندوستانی پنڈت وغیرہ سے ملاقات کی یا کچھ سیکھا حالانکہ یہ واقعہ اگر وقوع پذیر ہوتا۔ تو اپنی انوکھی نوعیت کے باعث اس قابل تھا کہ ہر مؤرخ اس کا ذکر کرتا۔ پس یہ قصہ محض بے ثبوت ہے۔

(۲) پنڈت لیکھرام اور پنڈت درشنانند جی کے بیانات مذکورہ بالا میں شدید اختلاف موجود ہے۔ جو بیان کنندگان کے دماغی اختراع کا کھلا کھلا ثبوت ہے۔ ایک اسے مکہ معظمہ کا واقعہ بتاتا ہے۔ اور دوسرا اس قصہ کو سرزمینِ شام سے منسوب کرتا ہے۔

(۳) آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانندجی نے شنکر آچاریہ اور ان کے شاگردوں کا ذکر "ستیارتھ پرکاش" باب ۱۱ میں کیا ہے۔ آپ نے شنکر آچاریہ کا زمانہ پیدائش "بائیس سو برس" پیشتر بتایا ہے۔ آپ کے بیان کے چند اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

(الف) "شنکر آچاریہ کے پہلے شیومت بھی تھوڑا سا رائج تھا۔ اس نے اس کی اور وام مارگ کی بھی تردید کی۔" (طبع پنجم ص ۳۰۹)

(ب) "جو جینیوں کی تردید کے لئے برہم برحق۔ عالم فانی اور جیو برہم کا ایک ہونا بیان کیا تھا۔ اس کا وعظ کرنے لگے۔ جنوب میں شرینگری مشرق میں بھوگو وردھن شمال میں جوشی اور دوارکا میں سارد امٹھ بنا کر شنکر آچاریہ کے شاگرد مہنت بن اور دولتمند ہو کر موج کرنے لگے" (ص ۳۱۰)

(ج) "جینیوں اور شنکر آچاریہ کے پیروؤں کے اپدیش کے اثرات آریہ ورت میں پھیلے اور باہم تردید و تائید بھی جاری رہی شنکر آچاریہ کے تین سو برس پیچھے اوجین شہر میں وکرم آدتیہ راجا کچھ اقبالمند ہوا۔ ..... لوگوں نے شنکر آچاریہ کو شیومت کا اوتار ٹھیرایا۔ ...... ان کے پیرو سنیاسی بھی شیومت میں شامل ہو گئے شیو مہادیو کی عبادت کرنے والے ہوئے۔" (ص ۳۲۰)

(د) "ان پوپوں کے چیلے بھی جینیوں کے بتخانوں میں جانے آنے لگے۔ اور ادھر مغرب میں کچھ دیگر مذہب اور **مسلمان لوگ** بھی آریہ ورت میں آنے جانے لگ گئے۔" (ص ۳۲۱)

ناظرین کرام! بانی آریہ سماج کے ان بیانات سے صاف ظاہر ہے۔ کہ شیومت اور شنکر آچاریہ میں کیا تعلق ہے۔ نیز یہ کہ شنکر آچاریہ کے شاگردوں کا دائرہ عمل

صرف ہندوستان اور اس کا بھی ایک محدود خطہ تھا۔ اور قبل اس کے کہ یہ لوگ بیرونی دنیا کی طرف توجہ کریں۔ وادیٔ عرب کے علمبردارانِ توحید سرزمین ہند میں وارد ہوگئے۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ آریہ سماج کے لئے پنڈت دیانند جی کی کتاب سے بڑھ کر کوئی مستند ثبوت دکھایا نہیں جا سکتا۔ پس پنڈت لیکھرام اور درشنانند جی نے جو افسانہ تراشا ہے۔ وہ محض ایک خیال ہے۔ جسکی حقیقت کچھ بھی نہیں۔[1] لہذا سورۂ فاتحہ کو ویدوں سے ماخوذ قرار دینا صداقت سے خالی دعویٰ ہے۔

---

[1] مگر یہ بات ہی سرے سے غلط ہے۔ کہ شنکر آچاریہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل پیدا ہوئے۔ کیونکہ زمانۂ حال کے مؤرخین و محققین نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ انکی پیدائش آٹھویں صدی میں ہوئی ہے جیساکہ مشہور آریہ سماجی پنڈت راجارام صاحب نے لکھا ہے کہ:۔

"وکرم سمت ۸۴۵ شک سمت ۱۰،۷ عیسوی ۷۸۸ء تھا۔ جسوقت شنکر آچاریہ پیدا ہوئے" (جیون چرتر شنکر آچاریہ صفحہ ۳۲)

کرنل الکاٹ بانی تھیوسوفیکل سوسائٹی نے لکھا ہے۔ کہ:۔

"لائق و فائق محققوں نے ان (شنکر آچاریہ) کا زمانہ مسیحیوں کی آٹھویں صدی میں قائم کیا ہے۔" (ہندو مذہب بدھ دہرم کے درمیان مشابہت صفحہ ۱۹)

ایک اور ہندو فاضل لکھتا ہے۔ کہ سوامی شنکر آچاریہ کی پیدائش "۷۸۸ء میں ہوئی اور وفات ۸۳۰ء میں ہوئی"

(رسالہ سرسوتی الہ آباد اکتوبر ۱۹۲۵ء صفحہ ۳۶۵)

پس جب یہ ثابت و ظاہر ہے۔ کہ شنکر آچاریہ آنحضرت صلعم کے بعد پیدا ہوئے۔ تو ایسی حالت میں سماجی پنڈتوں کا یہ کہنا کہ شنکر آچاریہ کے چیلوں نے جب عرب وغیرہ میں جاکر دہرم پرچار کیا تو انہی سے آپ نے سورۂ فاتحہ سیکھی۔ کیونکر درست ہوسکتا ہے؟ فضل حسین احمدی مہاجر قادیان

آریہ منتر اور سورۂ فاتحہ

آریہ صاحبان نے یجروید ۱۶/۴۰ کو بطور شہادت پیش کیا ہے۔ کہ سورۂ فاتحہ وید سے نقل کی گئی ہے۔ اس لئے ہم سب سے پہلے ذیل میں اس منتر کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:-

(۱) "اے دیو سروسیوا منور کرنا ہے جگدیشور! چونکہ ہم لوگ آپ کی زیادہ سے زیادہ شوق کے ساتھ تعریف کریں۔ اس لئے سب کو واقف آپ ہم سے بداطواری ملے گناہوں کو علیحدہ کریں اور ہم لوگوں کو وگیان کی دولت یا دولت سے ہوئے آرام کے لئے دہرم کے طریقے سے تمام منور گیان دیویں" (یجروید اردو ترجمہ مطبوعہ سام پریس شہر میرٹھ)

(۲) پنڈت راجا رام صاحب "ایش اپنشد" ہندی میں اس منتر کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اے اگنی! تو ہمارے کاموں کو جانتا ہے۔ ہم کو دولت کے لئے اچھے راستے سے لے چل۔ بُرے پاپ کو ہم سے دور کر۔ بار بار ہم تیری تعظیم کریں گے" (ص ۳۰)

(۳) پنڈت آریہ منی لکھتے ہیں:-

"اے با جاہ و جلال پرماتما! آپ ہمارے سب کاموں یا دلی ارادوں کو جانتے ہوئے ہم سب کو حصول دولت کے لئے اچھے راستہ سے لے چلیں اور بُرے گناہوں کو ہم سے دور کریں۔ ہم سب آپ کو بہت بہت نمسکار کرتے ہیں" (اپنشد آریہ بھاشیہ جلد ا صفحہ ۳۲)

(۴) گریفتھ صاحب سابق پرنسپل بنارس کالج اپنے انگریزی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۹۹ء میں حسب ذیل ترجمہ کرتے ہیں:-

by goodly path lead us

to riches, Agni, thou god who knowest all our works and wisdom. Remove the sin that makes us stray and wander, most ample adoration will be bring thee.

قارئین کرام! ہم نے متعدد ترجمے اس لئے پیش کر دئے ہیں۔ تاکہ منتر کا صحیح مفہوم سمجھنے میں مدد مل سکے۔ یہ وید منتر بے شک ایک مفید دعا ہے۔ اور اس کلام میں آہی کلام کی جھلک نظر آتی ہے۔ جس سے قرآن مجید کے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہ ہر قوم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی گذرے ہیں۔ (فاطر ع ۳) لیکن بایں ہمہ یہ سراسر ظلم ہوگا۔ اگر کہا جاوے کہ سورہ فاتحہ اس منتر سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ سورہ فاتحہ دعا کا ایک مکمل طریق ہے اور جامع دعا ہے۔ توضیح بیان کے لئے مندرجہ ذیل امور کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

(۱) وید منتر میں خدا تعالیٰ کو لفظ "اگنی" سے یاد کیا گیا ہے۔ اور یہ لفظ محض صفاتی نام ہے۔ جس کا اطلاق آگ پر بھی ہوتا ہے۔ بلکہ نیوگ کے گیارہ خاوندوں میں سے تیسرا خاوند اگنی کہلاتا ہے۔ پنڈت دیانند جی لکھتے ہیں:۔ "جو دو کے پیچھے تیسرا خاوند ہوتا ہے وہ بہت حرارت رکھنے سے اگنی نام والا۔ اور تیسرے چوتھے سے لے کر گیارھویں تک نیوگ سے خاوند ہوتے ہیں۔ وے نش نام سے موسوم ہوتے ہیں" (ستیارتھ پرکاش باب ۴ دفعہ ۱۳۶)

سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی "اللہ" مذکور ہے۔ اور یہ لفظ ذات باری کے سوا، نہ حقیقتاً نہ مجازاً، کسی دوسری ہستی کے لئے مستعمل نہیں ہوتا۔ "اللہ اسم الذات الواجب الوجود" (المنجد) گویا سورۂ فاتحہ کا لفظ ہر قسم کی شراکت کے منافی، صفات کاملہ کا جامع، ہر قسم کے نقص سے منزہ اور توحید الٰہی کا کامل مظہر ہے۔ وید کا لفظ ان تمام خوبیوں سے عاری ہے۔

(۲) وید منتر میں اگنی کو "سب سے واقف یا کاموں کو جاننے والا" کہہ کر صرف صفت علیم کو اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ جو زیادہ سے زیادہ انسان کو خوفزدہ بنا سکتی ہے۔ اور اس میں ایک قسم کا وعید پایا جاتا ہے مگر سورۂ فاتحہ میں مذکورہ صفات رب العالمین۔ الرحمٰن۔ الرحیم۔ مالک یوم الدین، انسان کے جذبات محبت کو ابھارنے والی اور اس کی امید کو بڑھانے والی ہیں۔ ان صفات کی تشریح "سورۂ فاتحہ کی تفسیر" کے باب میں درج ہوگی۔ انشاء اللہ

(۳) وید منتر میں گناہوں کے دور کرنے کی دعا ہے۔ اور یہ ایک اچھا مقصد ہے۔ مگر اس کو انتہائی مقصد نہیں کہہ سکتے۔ برائی سے بچ جانا یا گناہ کی سزا سے بچ جانا اچھی بات ہے۔ مگر کوئی خاص کمال نہیں۔ بلکہ نیکی حاصل کرنا اور اس میں ترقی کرتے جانا اصل قابل تعریف امر ہے۔ چوری نہ کرنا اچھی بات ہے۔ مگر قابل فخر نہیں۔ ہاں صدقہ کرنا، بیکسوں اور ناداروں کی مدد کرنا باعث رشک ہے اسی لئے سورہ فاتحہ کی دعا میں "اھدنا الصراط المستقیم" ہے یعنی ہمیں کامیابی کا سیدھا رستہ دکھا۔ اس پر چلا۔ منزل مقصود تک پہنچا۔ گویا وید منتر نے انسان کے سامنے نفی کا پہلو ہی پیش کیا ہے۔ اور بدی سے بچ جانا ہی بڑا کمال بنایا ہے۔ مگر اسلامی نقطہ نگاہ اس سے بہت بلند ہے اور وہ قرب الٰہی میں لانہایت ترقی کرتے جانا ہے۔

(۴) وید منتر کا نقطۂ مرکزی "دولت کی طلب" ہے۔ یا اگر گوش عقیدہ آریوں کا ترجمہ بھی مانا جاوے تو علم کا مطالبہ ہے۔ حالانکہ اول الذکر محض سطحی خیال پر مبنی ہے۔ اور محض دنیا دارانہ نقطۂ نظر۔ ثانی الذکر علم کا مطالبہ بھی کافی نہیں کیونکہ علم بذات خود کوئی خاص نعمت نہیں جب تک عمل نہ ہو۔ خالی علم بانجھ عورت کی مانند ہے۔ جس سے نیک پھل کی امید نہیں۔ صحیح علم اور عمل صالح مل کر صحیح نتیجہ پیدا کرتے ہیں۔ پس وید منتر کا مطالبہ فطرت بشری کا حقیقی اور کامل مطالبہ نہیں۔ سورہ فاتحہ کی دعا میں "الصراط المستقیم" کی جو تفسیر کی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم ولا الضالین۔ ہمیں وہ راستہ دکھا۔ اس راستہ پر چلا۔ جو ان لوگوں کا راستہ ہے۔ جن پر تو نے انعام کئے۔ نعمتیں نازل کیں۔ نہ ان کا جو تیرے غضب کے سزاوار ٹھیرے۔ اور گمراہ ہو گئے۔ گویا ایک مسلمان دولت۔ علم یا جائداد نہیں مانگتا۔ بلکہ آسمان وزمین اور کائنات کے رب سے **اس کی نعمتیں** مانگتا ہے۔ اس میں تخصیص نہیں ہر روحانی اور جسمانی نعمت پر شامل ہے۔ نبوت۔ صدیقیت۔ شہیدیت۔ ولائت وصالحیت اس میں داخل ہیں۔ پھر بادشاہت۔ صحت۔ علم۔ عقل۔ مال وغیرہ تمام نعمتیں اس جامع دعا کے اندر ہیں۔ اور پھر کمال یہ ہے۔ کہ "انعمت" کہہ کر وہ چیز مانگی جسے اللہ تعالےٰ ہمارے لئے نعمت سمجھتا ہو۔ کیونکہ بہت سی دولتیں تباہی کا موجب اور بہت سی اولادیں بدنامی کا سبب ہو جاتی ہیں۔ اور انسان علم غیب نہیں جانتا۔ اس لئے صرف یہ کہا۔ کہ آپ جو نعمت سمجھیں۔ وہ عطا فرماویں۔ اس میں بھی اشارہ کر دیا۔ کہ آپ اپنی شان کے مطابق ہی دیدیں میری زبان عاجز اور میری خواہشیں محدود ہیں۔ میں کیا مانگ سکتا ہوں

سبحان اللہ! کیا ہی پاکیزہ دعا ہے۔ افسوس ہے ان پر جو وید کی "دولت طلبی" کے متعفن جوہڑ کو قرآن پاک کے پاکیزہ بحر بیکراں "صراط الذین انعمت علیھم" کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔

(۵) سورۂ فاتحہ میں مذکورہ صفات آلہیہ کو دعا سے خاص تعلق ہے۔ اور ان میں ایک بے نظیر ترتیب موجود ہے۔ اور سچ تو یہ ہے۔ کہ ان صفات کے بغیر دعا ہو ہی نہیں سکتی۔ افسوس کہ وید منتر میں اس جوہر کا نام و نشان نہیں۔

(۶) وید کی دعا عالمگیر نہیں۔ یہ دعا صرف گناہ گار ہی کر سکتا ہے معصوم اور بے گناہ یہ دعا کس طرح کرے گا؟ پھر دولت بھی فقیر ہی مانگیگا۔ جس کے خزانے زر و جواہر سے بھر پور ہوں۔ کیا اس کے لئے یہ موزون ہے کہ دنیا کی حرص و آز میں "دولت طلبی" کا ہی وظیفہ پڑھتا رہے۔ برعکس اس کے قرآن مجید کی دعا عالمگیر ہے۔ اس کا دائرۂ اثر غیر محدود ہے۔ اس کے ثمرات غیر منقطع ہیں۔ انسان خواہ کسی حالت میں ہو۔ یہ دعا کر سکتا ہے جیسا کہ تفصیلاً ذکر ہو گا۔

(۷) وید منتر محض ایک سادہ سی دعا پر مشتمل ہے۔ مگر سورہ فاتحہ دعا بھی ہے، تعلیم اخلاق کا ذریعہ بھی۔ علوم کا خزانہ بھی۔ روحانیت کے اصولوں کا مخزن اور معرفت الٰہی میں زیادتی کا وسیلہ بھی۔ اور پھر اس میں قبولیت دعا کا طریق بھی مذکور ہے۔

(۸) وید منتر تو محض ایک گناہ گار اور کنگال کے وقتی جذبات کا معمولی سا اظہار ہے۔ مگر سورہ فاتحہ کامل دعا ہونے کے علاوہ ایک نہایت زبردست پیشگوئی پر مشتمل ہے۔ اور دنیا کی اہم ترین قوموں کا مستقبل بتا رہی ہے۔ پھر اس پیشگوئی کا بر وقت پورا ہو جانا خدا تعالیٰ کی ہستی کے منکروں کے برخلاف

ایک زبردست دلیل ہے۔ بھلا وید منتر کو سورہ فاتحہ سے نسبت ہی کیا ہے جبکہ بقول پنڈت لیکھرام سارے ویدی پیشگوئی کے وجود سے تہیدست ہیں۔

(۹) سورہ فاتحہ اللہ تعالیٰ کو مالک قرار دیتی ہے۔ اور ذرہ ذرہ کا پیدا کنندہ اور رب۔ مگر وید منتر ان تمام باتوں سے خالی ہے

(۱۰) سورہ فاتحہ توحید الٰہی کی مکمل تعلیم ہے۔ ذاتی۔ صفاتی اور عملی توحید کا صرف اللہ کو ہی حقدار بتاتی ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد پہ کامل روشنی ڈالتی ہے۔ مگر وید منتر لفظ "اگنی" سے شروع ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وید کے لاکھوں پیرو آگ اور سورج کے پرستار بن گئے۔ گویا سورہ فاتحہ توحید پرستی کا سبق اور وید منتر آتش پرستی کا ذریعہ بن گیا۔ تلک عشرۃ کاملۃ۔

اندریں صورت کسی شخص کا یہ کہنا کہ سورہ فاتحہ وید منتر سے ماخوذ ہے۔ آفتاب نیمروز کو شب دیجور قرار دینا ہے۔ اور ہم کسی عقلمند سے اسکی امید نہیں کر سکتے۔

آرین عقائد اور سورہ فاتحہ

آریہ صاحبان اگر غور کریں۔ تو ان کو صاف اقرار کرنا پڑیگا۔ کہ سورہ فاتحہ ویدک خیالات کا عکس نہیں۔ کیونکہ سورہ فاتحہ نہایت زور سے آرین عقائد کی تردید کر رہی ہے۔ تھوڑا سا نمونہ درج ذیل ہے:۔

(۱) آریہ سماج کا اعتقاد ہے۔ کہ ایشور۔ روح اور مادہ تین چیزیں ازلی ابدی ہیں۔ اور خدا تعالیٰ نے روح و مادہ کو پیدا نہیں کیا۔ بلکہ وہ بھی ازلیت و ابدیت میں اللہ تعالیٰ کے شریک ہیں۔ سوامی دیانند جی نے تو خدا تعالیٰ کو کمہار سے مشابہت دیکر صاف لکھا ہے "خدا اپنے اور دوسروں کے وصف عمل فطرت کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا" (ستیارتھ پرکاش) گویا روح و مادہ کی صفات اور فطرت بھی ازلی ہے۔ اور ایشور کا اس میں کچھ بھی دخل نہیں

نہ وہ ان کا خالق نہ ان کی صفات کا پیدا کنندہ۔ اس عقیدہ کا نام قدامتِ روح و مادہ ہے۔ سورہ فاتحہ کا لفظ لفظ اس کی تردید کر رہا ہے فرمایا "الحمد للہ" سب خوبیاں اللہ کی ذات میں ہی پائی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب روح و مادہ کا جوڑ دینا قابل تعریف امر ہے۔ تو ان کا خلق کرنا اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ خدا روح اور مادہ کو پیدا نہیں کر سکتا صرف جوڑ سکتا ہے۔ اسکی قدرت کو محدود کرنا ہے۔ اور یہ الحمد للہ کے منافی ہے۔ سورہ فاتحہ اللہ تعالےٰ کے لئے ہر اس فعل اور صفت کی مثبت ہے۔ جو اس کی حمد کا موجب ہو۔ چوری کر سکنا۔ جھوٹ بول سکنا قدرت نہیں عجز ہے اس لئے الحمد للہ نے ان کی تو نفی کی۔ مگر روح کا پیدا کرنا مادہ کو خلق کرنا چونکہ قدرت ہے۔ اس لئے اس کا اثبات کیا۔

آریوں کا یہ عقیدہ عیسائی صاحبان کی تثلیث کا ہمرنگ ہے۔ وہ بھی تین اقانیم کے قائل ہیں اور آریہ بھی تین خداؤں (خود بخود ہستیوں) کے معتقد ہیں اور ظاہر ہے۔ کہ خدا کا شریک خواہ اس کی ذات کے لحاظ سے ہو یا صفات کے لحاظ سے۔ اللہ تعالیٰ کے لئے موجب نقص ہے۔ اس لئے سورۂ فاتحہ "الحمد للہ" کہکر اس کی نفی کرتی ہے۔ اور "رب العالمین" میں ذات باری کے ماسوا کو اس کی مخلوق اور محتاج ثابت کرتی ہے۔ پس سورہ فاتحہ قدامت روح و مادہ کی تردید کر رہی ہے۔

(۲) اگرچہ وید منتر کے ترجمہ میں آریہ پنڈت بھی "ہمارے گناہوں کو ہم سے دور کریں" کے الفاظ درج کرتے ہیں۔ مگر آریوں کا اعتقاد یہی ہے۔ کہ ایشور کسی کے گناہ معاف نہیں کر سکتا۔ پنڈت دیانند جی لکھتے ہیں:۔

"سوال۔ ایشور اپنے بھگتوں کے پاپ معاف کرتا ہے یا نہیں؟

جواب - نہیں - کیونکہ اگر وہ پاپ معاف کرے - تو اس کا انصاف جاتا رہے"! (ستیارتھ پرکاش ص۲۰۸)

پنڈت لیکھرام نے لکھا ہے :-

"بے شک توبہ کرنے کی ہندو لوگ بہت پرواہ نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں - کہ اس سے کچھ فائدہ نہیں۔ گناہ کی سزا ضرور ملیگی - کسی طرح ایک شوشہ نہیں ٹلیگا"! (کلیات آریہ مسافر ص۵)

قرآن مجید اور خصوصیت سے سورۃ فاتحہ نے اس عقیدہ کی تردید کی ہے۔ اس سورہ میں اللہ تعالےٰ کی جس قدر صفات مذکور ہیں - سب اس کی محبت اور رحم کے رنگ میں ظاہر کر رہی ہیں - رب العالمین - الرحمٰن - الرحیم اور مالك ایک ہی مقصد کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں - اور مالك یوم الدین میں جو ایک پہلو سزا کا مذکور ہے وہ بھی امید افزا ہے - کیونکہ سورۃ فاتحہ خدا تعالیٰ کو محض ایک جج ثابت نہیں کرتی - جس کی ذمہ داری صرف اس قدر ہوتی ہے۔ کہ مدعی و مدعا علیہ میں صحیح فیصلہ کر دے - بلکہ وہ اسے مالک قرار دیتی ہے - جو اپنی ملک میں جس طرح چاہے تصرف کر سکتا ہے بے شک جج معاف نہیں کر سکتا لیکن مالک معاف کر سکتا ہے - بلکہ بسا اوقات معاف کرنا ہی انسب ہوتا ہے۔ لہذا سورہ فاتحہ آریوں کے اس عقیدہ کا بھی بطلان کر رہی ہے۔

(۳) مقدم الذکر ہر دو خیالات کے نتیجہ میں آریہ سماجی عقیدہ تناسخ یا آواگون کے بھی قائل ہیں - یعنی ایشور ان ہی محدود روحوں کو گناہوں کے بدلہ بار بار سئور - بندر اور حشرات الارض کی جونوں میں ڈالتا رہتا ہے۔ اور انسان اسی دنیا میں مختلف قالبوں میں جزا و سزا بھگتتے رہتے ہیں - بے شک خدا تعالیٰ کی قدوس شان کے پیش نظر یہ ایک گھنونا سا عقیدہ ہے - لیکن

خشت اول چوں نہد معمار کج + تا ثریا مے رود دیوار کج

ایشور نئی روح اور پرکرتی پیدا نہیں کر سکتا۔ اب اگر انہیں چند ہزار یا چند کروڑ روحوں کو بار بار تناسخ کے چکر میں نہ ڈال رکھے۔ تو کیا بالکل بیکار ہو بیٹھے۔ پھر وہ گناہ معاف نہیں کر سکتا۔ اس لئے ضروری ہوا۔ کہ عاجز گنہگاروں کو انسانیت سے محروم کر کے جذبہ انتقام کو سیر کرتا ہے۔ سورہ فاتحہ نے رب کہہ کر انتقامی سزا کی نفی کی۔ پھر مالک یوم الدین میں قیامت کے دن کا ذکر کر کے عقیدہ تناسخ کا صریح ابطال کیا۔ انسان کے عمل دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) جو اس کے مرنے کے ساتھ ہی منقطع ہو جاتے ہیں (۲) جن کے نیک اثرات اس کی موت کے بعد بھی جاری رہتے ہیں۔ لہذا مکمل جزا و سزا کے لئے قیامت کا وجود عقلاً بھی ضروری ہے۔ اور قیامت کے دن سے تناسخ کا تار و پود بکھر جاتا ہے۔

(۴) آریوں کا خیال ہے۔ کہ ہمیں اس زندگی میں جو بھی نعمتیں ملتی ہیں۔ سب ہمارے گذشتہ اعمال کا نتیجہ ہیں۔ جو ہم نے کسی نامعلوم جون میں کئے تھے۔ ظاہر ہے۔ کہ اگر یہ خیال درست ہو۔ تو نہ ایشور کا بندوں پر احسان ہے اور نہ کسی بندہ کا کسی پر احسان ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ والدین کا حسن سلوک بھی ہمیں اپنے ہی کسی گذشتہ احسان کا بدلہ ماننا پڑے گا۔ سورہ فاتحہ اس خیال کی تردید کرتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو الرحمٰن قرار دے کر بتلاتی ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کے احسانات ہمارے اعمال کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ اس کے احسانات پہلے ہیں۔ اس کی نعمتیں بغیر ہمارے عملوں کے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ سورج۔ چاند۔ ہوا۔ پانی۔ زمین اور دیگر ضروریات زندگی میرے عملوں کا نتیجہ ہیں؟ یہ وہم باطل ہے۔ اور حقیقت وہی ہے۔ جو سورہ فاتحہ ظاہر کر رہی ہے۔ کہ

خدا تعالیٰ بے انتہا کرم کرنے والا ہے۔ اور یہ اس کا ذاتی وصف ہے ہمارے اعمال کا نتیجہ نہیں۔

(۵) آریوں کے نزدیک ایشور انسان کے اپنے اعمال کے علاوہ کوئی نیک سلوک اس سے نہیں کر سکتا۔ اور نہ اس کے نیک بدلہ میں زیادتی کر سکتا ہے حتیٰ کہ بعض نادان تو اس احسان کا نام بے انصافی اور توبہ کنندہ اور غرق ندامت میں غرق بندہ کے گناہ معاف کر دینے کا نام ظلم قرار دیتے ہیں۔ سچ ہے۔ وما قدروا اللّٰہ حق قدرہٖ۔

سورۂ فاتحہ ایک طرف ماضی کے احسانات کو صفت رحمٰن کا نتیجہ بتاتی ہے تو دوسری طرف اُسے الرحیم کہہ کر ہمیشہ اور بار بار رحمت کرنے والا۔ احسان کرنے والا۔ نیک اعمال کا زیادہ سے زیادہ بدلہ دینے والا قرار دیتی ہے۔ اور پھر لفظ "انعمت علیہم" میں اللہ تعالیٰ کو انعام کرنیوالا ثابت کرتی ہے۔ اور انعام یقیناً نیک عمل کے بدلہ سے زیادتی کا نام ہے۔ پس سورۂ فاتحہ آریوں کے اس اعتقاد کی بھی تردید کرتی ہے۔

(۶) متذکرۃ الصدر اوہام کی وجہ سے آریہ سماج یہ بھی عقیدہ رکھتی ہے۔ کہ اگر کوئی خوش قسمت روح ایشور کے آہنی شکنجہ سے بچ نکلے اور کسی نہ کسی طرح مکتی کی حقدار بن ہی جاوے۔ تو بھی وہ ہمیشہ کے لئے مکتی خانہ میں نہیں رہ سکتی بلکہ جلد یا بدیر اسے پھر اسی دارالمحن اور بندھنوں کی دنیا کی طرف لوٹنا اور گدھا و بندر وغیرہ بننا پڑتا ہے۔ گویا آریہ سماج نجات کو محدود مانتی ہے۔ اور اس عقیدہ کی تائید میں بانیٔ آریہ سماج جیسا "لاثانی فلاسفر" لکھتا ہے۔ کہ اگر روحیں ابدالاباد کے لئے مکتی خانہ میں رہیں۔ تو
"مکتی کے مقام پر بہت سی بھیڑ بھاڑ ہو جائے گی۔ کیونکہ آمد زیادہ

اور نکاس کچھ بھی نہ ہونے کی وجہ سے وہاں زیادتی کا کچھ وار پار نہیں رہے گا...... کیا تھوڑی قید کی نسبت عمر بھر کی قید یا پھانسی کو کوئی سزا پانیوالا اچھا سمجھتا ہے"۔ (ستیارتھ باب ۹ صـ۲۶)

اس بازیچۂ طفلاں دلیل کی رزانت سے قطع نظر کرتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ آریہ سماج نے نجات کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں۔ اسی لئے انہوں نے اس کو محدود قرار دے دیا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں نجات اور جنت کو خدا انعم کی نعمت قرار دیا ہے۔ انعمت علیہم۔ اگرچہ نعمت الٰہیہ کے لفظ میں بھی دوام پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جب کسی شخص یا قوم پر نعمت کرتا ہے۔ تو اس کو چھینا نہیں کرتا۔ جب تک کہ وہ لوگ خود نہ بدل جاویں۔ ذالک بان اللہ لم یک مغیراً نعمۃ انعمہا علیٰ قوم حتی یغیروا ما بانفسہم (انفال ع) لیکن غیر المغضوب علیہم ولا الضالین۔ کہ کر تو اس کے دوام کو موکد فرما دیا۔ آیت ایاک نعبد و ایاک نستعین بھی اس پر دلالت کر رہی ہے۔

(۷) آریہ کہتے ہیں کہ خدا کا کلام صرف وید ہے۔ جو آریہ ورت یا تبت میں نازل ہوا۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے کسی ملک یا کسی قوم میں نبی نہیں بھیجا۔ اور نہ اپنا کلام نازل کیا۔ قرآن مجید اس خیال کی تردید کر رہا ہے فرمایا:۔ وان من امۃ الا خلا فیہا نذیر (فاطر) ہر قوم میں نبی گذرے ہیں۔ ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولاً ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت (النحل ع) یقیناً ہم نے ہر قوم کی طرف رسول بھیجے ہیں جو یہ تعلیم دیتے تھے۔ کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اور بتوں سے اجتناب اختیار کرو۔ سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالےٰ نے اپنی صفت رب العالمین ذکر کر کے بتایا ہے۔ کہ میں آریوں

کا ہی یا بنو اسرائیل کا ہی خدا نہیں ہوں۔ بلکہ سب جہانوں کا رب ہوں۔ اور میں نے جس طرح جسمانی تربیت کے لئے ہر قوم۔ ہر ملک اور ہر جنس کے لئے سورج روشن کیا ہوا پیدا کی پانی نازل کیا۔ اسی طرح روحانی تربیت کیلئے کتابیں نازل کیں۔ انبیاء نازل فرمائے اور سب کو اپنے نور سے منور کیا۔

(۸) آریہ سماجی اعتقاد رکھتے ہیں۔ کہ نہ صرف یہ کہ چار رشیوں کی مانند کوئی اور مکالمہ الٰہیہ سے مشرف نہیں ہوا۔ بلکہ ہو بھی نہیں سکتا۔ اس دروازہ پر مُہر لگ گئی اور اس دنیا کے آخر تک اس دروازہ کا کھُلنا ناممکن اور محال ہے۔ مگر سورۂ فاتحہ اپنے متبعین کے لئے وحی والہام کا دروازہ کھلا بتلا رہی ہے۔ بلکہ اس نعمت کے پانے کی دعا سکھلا رہی ہے۔ اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم۔ آریہ سماج کا عقیدہ مایوس کُن ہے۔ اور سورۂ فاتحہ امید افزا۔ رات اور دن کا فرق ہے۔

(۹) آریوں کے نزدیک سنسکرت کی مردہ زبان کے علاوہ کسی زندہ زبان میں خدا کا کلام نازل نہیں ہو سکتا۔ مگر سورۂ فاتحہ اسکی عملی تردید کر رہی ہے۔

(۱۰) آریہ سماج ساری دنیا کے انسانوں میں روحانی مساوات کی قائل نہیں۔ شودر اور برہمن کا فرق موجود ہے۔ عورت کی پیدائش ہی گناہ کا نتیجہ قرار دی گئی ہے۔ (ستیارتھ ۹/ہم) پھر آریہ سماج اللہ تعالےٰ سے مدد مانگنے کی اقراری نہیں۔ کیونکہ اس کے نزدیک ہر نتیجہ ہمارے عمل کا نتیجہ ہے۔ ایشور تو محض ایک بے جان مشین کی طرح کام کر رہا ہے۔ لہذا اس سے مدد مانگنا فضول ہے۔ سورۂ فاتحہ کے فقرہ ایاک نعبد وایاک نستعین میں ان دونوں پہلوؤں کی تردید کی گئی ہے۔ اور بتایا کہ سب انسان ایک ہی معبود کے بندے ایک ہی خالق کی مخلوق اور بھائی بھائی ہیں۔ کوئی اونچ نیچ نہیں۔ کوئی اچھوت

اور ناپاک نہیں۔ سب پاک پیدا ہوتے ہیں۔ اور پھر صرف اللہ تعالےٰ کی ذات ہی اس قابل ہے۔ کہ جس سے ایک سچا مسلمان مدد مانگتا ہے اور وہی ہے۔ جو بحر و بر کی ظلمتوں، دنیا کے نشیب و فراز اور آفات کی تیرہ و تاریک گھڑیوں میں مدد کرتا ہے۔ واللہ المستعان۔ سورۂ فاتحہ نے الوہیت کے مقام اور انسانیت کے درجہ کی پوری تشریح کر دی ہے۔ اور ایاك نعبد و ایاك نستعین کے نقطہ پر لا کر جمع کر دیا ہے۔

تلك عشرة كاملة

قابل غور امر ہے۔ کہ سورۂ فاتحہ آریہ عقائد کی جڑوں پر تبر رکھ رہی ہے اور ہر باطل عقیدہ کی تردید کر رہی ہے مگر بعض سادہ لوح یا ضرورت سے زیادہ ہوشیار سورۂ فاتحہ کو وید سے ماخوذ بتا رہے ہیں۔ کیا یہ مقام تعجب نہیں۔ کہ بانی آریہ سماج تو سورۂ فاتحہ پر اعتراضات کرے (ملاحظہ ہو ستیارتھ پرکاش باب ۱۴) مگر ان کے چیلے اسے وید منتر کا ترجمہ بتا رہے ہیں۔ کیا دیانند جی وید پر ہی اعتراض کرتے رہے؟

ہمارے مندرجہ بالا بیانات سے آرین دعویٰ کی مکمل تردید ہو گئی ہے آئیے اب عیسائی صاحبان کے خیال کی تحقیق کریں:

وباللہ التوفیق

باب چہارم

عیسائی دعویٰ کی تردید

پادری پال صاحب کا بیان اوپر درج ہو چکا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امیہ بن ابی الصلت کے سحر افگن شعر سن کر بائبل کی طرف توجہ کی ہوگی۔ اور مکہ سے شروع کر کے مدینہ کی زندگی میں سورۂ فاتحہ کا انتخاب مکمل کر لیا ہوگا۔ اس بیان میں امیہ کا وجود ایک نئی چیز ہے۔ ورنہ یوں کہنے کو عیسائی آریہ کہتے ہی رہتے ہیں۔ کہ قرآن مجید بائبل یا وید سے لیا گیا ہے۔ مگر یہ تو ایک دعویٰ بلا دلیل ہے۔ اور ایک سمجھدار انسان بغیر کسی بنیاد کے اتنا بڑا دعوےٰ کرتا ہوا جھجکتا ہے۔ اس لئے پادری ایس ایم پال صاحب نے امیہ کا ذکر گویا بطور دلیل کیا ہے۔ اور اسے بائبل اور آنحضرت کے درمیان واسطہ بنایا ہے۔ اگرچہ پادری صاحب نے اس مرتبہ پر "ہوگا" کا اس کثرت سے تکرار کیا ہے۔ کہ کسی مزید تحقیقات کی ضرورت نہیں رہتی۔ کیونکہ جو دلیل مقدمات ظنیہ سے مرکب ہو وہ یقینی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم اسے دلیل کہہ ہی نہیں سکتے۔ لیکن تاہم ہم مضمون کے اس حصہ کو تشنۂ تحقیق چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اور پادری صاحب کے اس مغالطہ کا بھی جواب دیتے ہیں۔ مگر جواب سے پیشتر پادری صاحب کو عیسائیت کی

حقیقت بتانے کے لئے مسیحیوں کا ایک معتبر ترین اقتباس درج کرتے ہیں۔ لکھا ہے:۔

"نظر انصاف سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہت سی باتوں کے لحاظ سے یونان کے فلسفیوں کی تعلیم مسیحی دین کی تعلیم کا پیش خیمہ تھی۔ اور یونانیوں کے اس مذہب نے مسیحی دین کے لئے ایک راستہ کھول دیا۔ یونانیوں کا یہ مذہب ایک رنگ بدل کر رومی حکومت کی تعلیم یافتہ جماعت میں اس وقت رائج تھا۔ جبکہ دین عیسوی کا ظہور ہوا۔" (رسالہ "تاریخ مذاہب" صفحہ ۲۲ شائع کردہ پنجاب ریلجس بک سوسائٹی لاہور)

پادری صاحب! فرمائیے کہ مسیحیت کے یونانیوں کے فلسفیانہ مذہب کے ماخوذ نہ ہونے کا کیا ثبوت ہے؟

آنحضرت صلعم نے امیہ کے شعر کب سنے؟

پادری صاحب نے صرف عمرو بن الشرید عن ابیہ کی روائت ذکر کی ہے۔ کہ آنحضرت صلعم نے مجھسے امیہ کے سو شعر سنے۔ جبکہ میں سواری پر آپ کے ساتھ سوار تھا۔ یہ روائت شمائل ترمذی صفحہ ۱۶ پر بھی مندرج ہے۔ اس روائت کے آخری لفظ یہ ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ "ان کاد لیسلم" کہ یہ شخص امیہ داخل اسلام ہو جاتا۔ یہ روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی سے تعلق رکھتی ہے جہاں پر ردیف بٹھانے کے مواقع پیش آئے۔ چنانچہ شمائل ترمذی کے اسی صفحہ پر حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ "کاد امیۃ بن ابی الصلت ان یسلم"۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ حضرت ابو ہریرہؓ کو مدنی زندگی میں ہی شرف صحابیت حاصل ہوا ہے۔ غرض آنحضرت صلعم کا امیہ کے شعر سننے کا واقعہ مدینہ کا ہے۔ اور یہ امر پادری پال صاحب کی تردید کے لئے کافی ہے۔

کیونکہ وہ تسلیم کر چکے ہیں۔ کہ "آنحضرتؐ نے اس انتخاب کو مکہ سے شروع کیا۔ اور مدینہ میں جا کر ختم کیا"۔ صہ ۶۔ پس اگر بنیاد امیہ کے اشعار پر ہے۔ تو انتخاب کی بنیاد مکہ نہیں ہو سکتی۔ اور اگر انتخاب کی ابتدا مکہ معظمہ سے درست ہے تو امیہ کے اشعار کو بنیاد قرار دینا باطل ہے۔ غرض اعتراض غلط ہے۔ درحقیقت سورہ فاتحہ مکیہ ہے۔ جیسا کہ ہم آئندہ صفحات میں ذکر کرینگے۔ اس لئے امیہ کے اشعار سننے کا اس کے ساتھ دور کا علاقہ بھی نہیں۔

امیہ کے اشعار اور بائبل کا ذکر

اس مقام پر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امیہ کے اشعار میں بائبل کا ذکر ہے۔ تا ان کے پڑھنے یا سننے سے تورات اور انجیل کی طرف توجہ اور شوق پیدا ہو سکے؟ جواب یقینی طور پر نفی میں ہے۔ پادری صاحب نے امیہ کے آٹھ دس شعر انتخاب کر کے اپنے رسالہ میں لکھے ہیں۔ مگر ان میں بائبل کی طرف اشارہ بھی نہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے بھی اس کے بہت سے اشعار کا مطالعہ کیا ہے۔ مگر ان میں کسی جگہ تورات وانجیل کی مدح وثنا تو ایک طرف ذکر اور اشارہ تک موجود نہیں۔ اندریں صورت محض اس امر سے کہ آنحضرت صلعم نے ایک مرتبہ امیہ کے بعض اشعار سنے تھے۔ یہ استدلال کرنا کہ آپ نے بائبل مقدس کی طرف توجہ کی ہوگی۔ اور وہاں سے ہی سورہ فاتحہ کا انتخاب کر لیا ہوگا۔ ایک انوکھا استدلال ہے۔ اور شاید ایک نین اور تین ایک ماننے والوں کے سوا کوئی دانشمند اس استدلال کو درست قرار نہ دے سکیگا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے۔ کہ چونکہ چاول سفید ہیں اس لئے زمین گول ہے۔ اے بھائی! دعویٰ اور دلیل میں کوئی جوڑ بھی تو ہو؟۔

کیا امیہ عیسائی تھا؟

پادری سلطان پال صاحب نے امیہ بن ابی الصلت کو

"مسیحی شاعر" قرار دے کر اپنے خیالی محل کو تعمیر کرنا چاہا۔ (ص۹) حالانکہ یہ بنیاد بالکل غلط ہے۔ امیہ کا عیسائی ہونا ہرگز ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ امیہ نے کتب سابقہ مطالعہ کی تھیں۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ کہ وہ مسیحی تھا۔ ہمیں اس جگہ اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ کہ اس زمانہ کے عیسائی لوگوں کے مشرکانہ عقائد اور بدترین اعمال کا امیہ کے عقائد یا اشعار سے موازنہ کریں۔ پادری صاحب نے تو امیہ کے عیسائی ہونے کا نہ کوئی ثبوت دیا ہے اور نہ دے سکتے ہیں۔ لیکن میں ذیل میں عیسائی مورخ کی شہادت سے ثابت کرتا ہوں۔ کہ امیہ ہرگز مسیحی نہ تھا۔ اس وقت میرے سامنے عیسائی ادارہ بنام وکالتہ الغریر۔ اسکندریہ کی شائع کردہ کتاب "تاریخ الآداب العربیہ" موجود ہے۔ فاضل مصنف لکھتا ہے:-

"ھو ابو عمرو امیۃ بن ابی الصلت الثقفی من الشعراء المشھورین نظر فی الکتاب وقرأھا ولبس المسوح تعبدا وشک فی الاوثان وحرام الخمر وکان علی دین الحنیفیۃ وھو دین قوم من العرب یقولون انھم لا یزالون علی مذھب ابراھیم الخلیل وھو القائل:-

؎ کل دین یوم القیامۃ عند اللہ الا دین الحنیفیۃ زور"

(ص۹ مطبوعہ ۱۹۲۷ء)

ترجمہ۔ ابو عمرو امیہ بن ابی الصلت ثقفی۔ مشہور شعراء میں سے ہے اس نے کتابوں پر نگاہ ڈالی۔ اور ان کا مطالعہ کیا۔ عبادت کی نیت سے ٹاٹ پہن لئے۔ بتوں کی عبادت میں شبہ کیا۔ شراب کو حرام قرار دیا اور وہ دینِ حنیفی پر تھا۔ اور یہ دین عرب کی ایک قوم کا مذہب تھا۔ جو کہتے تھے کہ ہم

ہنوز ابراہیمی مذہب پر ہیں۔ امیہ ہی کا شعر ہے کہ قیامت کے روز اللہ کے پاس سب دین جھوٹے اور عبث ثابت ہوں گے بجز دین الحنیفیہ کے۔"

اس اقتباس سے واضح ہے۔ کہ امیہ بن ابی الصلت مسیحی نہ تھا۔ یہودی نہ تھا۔ بلکہ دین الحنیفیہ کا معتقد تھا۔ اور اس مذہب کے قائل اپنے رنگ میں توحید پرست تھے۔ جیسا کہ استاذ انیس المقدسی یسوعی پروفیسر امریکن کالج بیروت نے عرب الجاہلیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:-

كان بينهم كثير من القبائل المسيحية واليهودية
وبعض من الموحدين من غير هؤلاء فكان العرب
عموماً يعرفون شيئاً عن الله الخ"
(الدول العربية وادابها ص ۴۹)

کہ ان میں مسیحی۔ یہودی اور بعض دیگر موحدین قبائل موجود تھے اور عرب عموماً ذات باری کے متعلق کچھ نہ کچھ علم ضرور رکھتے تھے۔

پس امیہ مسیحی ہرگز نہ تھا بلکہ عرب کے گروہ موحدین کا ایک فرد تھا۔ معزز قارئین! پادری صاحب کے اس خیال خام کی بنیاد امیہ کی مسیحیت پر تھی۔ مگر یہ خود ایک باطل خیال ہے۔ اس لئے ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج + تا ثریا مے رود دیوار کج

پس نہ امیہ کے اشعار سے نہ اس کے مذہب سے بائبل کی طرف خیال جا سکتا ہے۔ لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بائبل سے سورہ فاتحہ کے انتخاب کرنے کا اعتقاد ایک افسانہ ہے وبس۔

امیہ کیوں خاموش ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت مہد میں موجود الوقت جلیل القدر شعراء لبید بن ربیعہ

کعب بن زہیر اور حسان بن ثابت وغیرہم رضی اللہ عنہم نے اسلام قبول کرلیا۔ مگر امیہ اسلام میں داخل نہ ہُوا۔ بلکہ مخالفت پر کمر بستہ ہوگیا۔ اور جان توڑ مخالفت کی۔ لکھا ہے :۔

" وکان امیة یخبر ان نبیاً یخرج قد اظل زمانه و کان یؤمل ان یکون ذالک النبی فلما بلغه خروج النبی صلی اللہ علیه وسلم کفر به حسداً له "

ترجمہ۔ امیہ خبر دیا کرتا تھا۔ کہ ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے۔ اس کا زمانہ آچکا ہے۔ اور اسے امید تھی۔ کہ میں ہی وہ نبی ہونگا۔ لیکن جب اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی خبر پہنچی۔ تو اس نے ازراہِ حسد آنحضرت صلعم کا انکار کیا "۔ (الشعر والشعراء لابن قتیبہ صفحہ ۱۷۶)

مسیحی مصنف لکھتا ہے :۔

" ولما اظهر محمد بن عبداللہ دعوته انضم امیة الی مقاومیه وکان یحرضهم علی مناوأته وقتاله ویرثی قتلاهم ببدر وقد ذکر عنه ابوالفرج الاصفهانی اموراً غریبة لاتقبل التصدیق وتدل ان الرجل لم یخل من الوساوس والطمع فی التنبؤ واللہ اعلم "

ترجمہ:۔ جب محمد بن عبداللہ نے اپنا دعویٰ ظاہر کیا۔ تو امیہ آپ کے مخالفین کی صف میں جا ملا۔ اور وہ ان کو آنحضرت کی دشمنی اور لڑائی کے لئے برانگیختہ کرتا تھا۔ وہ ان کے مقتولینِ بدر کا مرثیہ کہتا تھا ابوالفرج اصفہانی نے اس کے متعلق بعض ناقابل تصدیق عجیب امور ذکر کئے ہیں۔ بہرحال ان سے ظاہر ہے۔ کہ امیہ وساوس میں مبتلا تھا

اور اسے جھوٹا نبی بننے کی طمع تھی۔" (تاریخ الآداب العربیہ صہ ۹۲)

ہر دو عبارتوں سے امیہ کی اسلام دشمنی اور اس کا سبب ظاہر ہے اب سوال یہ ہے۔ کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سحر افگن اشعار کی وجہ سے بائبل کا مطالعہ کر کے سورہ فاتحہ بنائی تھی۔ اور تمام عرب بلکہ لبید العامری جیسا افضل الشعراء بھی خاموش تھا۔ تو کیوں نہ امیہ نے ہی آنحضرت صلعم کی اس کارروائی کا ذکر کر کے حضور کو رسوا کرنا چاہا۔ جس کو آج تیرہ سو برس بعد ایک پادری ذکر کر رہا ہے۔ یہ ایک قابل غور امر ہے۔ اور واقعہ یہ ہے۔ کہ امیہ نے پیٹ بھر کر دشمنی کی۔ مگر پادری پال صاحب والا انکشاف وہ بھی نہ کر سکا۔ سچ ہے۔ لکل فن رجال۔

اس سے بڑھ کر میں کہتا ہوں۔ کہ اگر پادری صاحب کے بیان میں ایک ذرہ بھی صداقت ہوتی۔ اور سورہ فاتحہ آنحضرت ؐ کے اپنے انتخاب از بائبل کا نتیجہ ہوتا تو کیا امیہ کے لئے مناسب نہ تھا۔ کہ وہ اس سے بھی اچھی سورۃ بائبل سے انتخاب کر لیتا۔ اور اس طرح قرآن پاک کی اس عالمگیر تحدی کا توڑنے والا بن جاتا۔ کہ قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یأتوا بمثلہ لا یأتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا (بنی اسرائیل) اگر سب جن وانس مل کر بھی قرآن پاک کی مثل لانا چاہیں۔ تو ہرگز نہیں لا سکتے۔ مگر امیہ کا ایسا نہ کرنا یا نہ کر سکنا پادری صاحب کی کھلی کھلی تردید ہے۔

امیہ بحیثیت شاعر

برسبیل تذکرہ اس جگہ یہ ذکر کر دینا بھی مناسب ہے۔ کہ اگرچہ امیہ ایک مشہور شاعر ہے۔ مگر اسے بلیغ شاعروں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ جن کا قول حجت ہو۔ اور اس میں کوئی امتیازی خوبی بھی نہیں تھی۔ صرف وہ عربی زبان میں بعض غیر عربی اور نادر استعمالات کی وجہ سے شہرت پا گیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:۔

"وانفرد فی شعرہ بالفاظ کثیرۃ غریبۃ لاتعرفہا العرب

فکان یسمی اللہ عزوجل السلطبیط والتغرور۔"

امیہ اپنے اشعار میں ایسے اچنبھے الفاظ لانے میں منفرد ہے جنہیں

عرب نہیں جانتے وہ اللہ تعالیٰ کا نام السلطیط اور التغرور رکھا کرتا تھا۔"

(تاریخ الآداب العربیہ ص۹۱)

امام ابو محمد الدینوری لکھتے ہیں :۔

"واتی بالفاظ کثیرۃ لاتعرفہا العرب وکان یاخذھا

من الکتب منہا قولہ وخان امانتہ الدیک الغراب الخ۔"

امیہ بہت سے ایسے الفاظ لایا ہے جنہیں عرب نہیں جانتے ۔اور

وہ یہ الفاظ کتابوں سے لیا کرتا تھا۔ ایک قول اسکا یہ ہے ۔کہ کوے

نے مرغ کی امانت میں خیانت کی" (الشعر والشعراء ص۱۷۶)

اخیر پر لکھا ہے :۔"وعلماؤنا لایرون شعرہ حجۃ علی الکتاب"

ہمارے علماء اس کے اشعار کو قرآن مجید کے لئے حجت نہیں جانتے" (ر ص۱۷۷)

گویا امیہ کا قول سند نہیں ۔یہ اس شاعر کی پوزیشن ہے ۔جسے پادری بال نے

بزعم خویش قرآن مجید کا ماخذ بنانے کی ناکام کوشش کی ہے ۔پس اس شاعر

میں کوئی خاص وصف نہیں ۔اس کی فصاحت و بلاغت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم

کی ذاتی بلاغت کا بھی ہاسنگ نہیں ۔کہاں افصح الناطقین بالضاد اور کہاں

امیہ بن ابی الصلت ؟ ع

این الثریا و این الثریٰ

ہاں امیہ شرک سے بیزار تھا ۔اور اس کے اشعار میں توحید الٰہی کا کچھ ذکر

تھا ۔اور توحید کے عاشق ازلی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے اشعار سے

اسی جہت سے گونہ خوشی ہوتی تھی۔ اسی لئے فرمایا آمن شعرہ وکفر قلبہ
الغرض امیہ بن ابی الصلت سے متعلق اعتراض ہر پہلو سے باطل ہے وہو المراد
امیہ کے اشعار سے بائبل کی طرف شوق پیدا ہونے کی مکمل تردید کے بعد
ہم اس اعتراض کے عام پہلو کو لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم امی تھے
لکھ پڑھ نہ سکتے تھے۔ بائبل کا عربی ترجمہ موجود نہ تھا۔ اس لئے میں کہتا ہوں۔
کہ اگر بائبل کی طرف شوق پیدا بھی ہو۔ تب بھی حالات اس شوق کے پورا ہونے
میں سد سکندری بن رہے ہیں۔ اسی دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے:۔ وماکنت تتلوا من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک
اذاً لارتاب المبطلون (عنکبوت ع ۵) کہ اگر تو پڑھنے اور لکھنے والا ہوتا تو
باطل پرستوں کے لئے شک کی کوئی وجہ ہو سکتی تھی۔ مگر اب تو ان کی سراسر
ضد اور بے جا ہٹ ہے۔

پھر جیسا کہ ہم باب اول میں لکھ آئے ہیں۔ سورۃ فاتحہ کے متعلق بائبل
میں پیشگوئی موجود ہے۔ جو اس کا محض منجانب اللہ ہونا بتا رہی ہے۔
ان حقائق کے باوجود اگر پادری صاحب اور ان کے ہم نوا یہی کہتے جائیں
کہ سورۃ فاتحہ بائبل سے ماخوذ ہے۔ تو میں اس جگہ مزید دو اصولی جواب
پیش کرتا ہوں۔ جن کی تردید کر سکنا ناممکن اور محال ہے۔ میں یقیناً کہتا
ہوں۔ کہ یہ وہ سنگ گراں ہے۔ کہ پادریوں کے چھوٹے اور بڑے مل کر بھی
اس کو ہلا نہیں سکتے۔

(۱) اگر سورہ فاتحہ بائبل سے ہی انتخاب کی گئی ہے۔ تو کیا وجہ ہے۔ کہ
موسیٰ۔ یوشع اور پھر عیسیٰ بن مریم ایسی مقدس ہستیاں، بائبل کی حامل و حامی
ہستیاں بائبل سے یہ انتخاب نہ کر سکیں اور عرب کے ایک بادیہ نشین نے

یہ انتخاب کر دکھایا؟ فرض کر لو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بذاتِ خود بائبل سے یہ انتخاب کیا ہے۔ مگر پھر بھی یہ اتنا بڑا معجزہ اور ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ کہ عیسائی اور یہودی دنیا تو کیا موسیٰ اور عیسیٰ بھی یہ کام نہ کر سکے مسیح نے جو خلاصہ نکالا اور جو دعا روزمرہ مانگنے کے لئے حواریوں کو تلقین کی۔ وہ ایسی سطحی اور عامیانہ ہے۔ کہ پادری پال کا دل بھی اس کو سورہ فاتحہ کے مدمقابل رکھتے ہوئے شرماتا ہے۔ اسی لئے وہ قرآنی دعا کے سامنے انجیلی دعا کو رکھنے کی بجائے نحمیاہ۔ یرمیاہ۔ زبور۔ سلاطین اور متی کے نوشتوں میں سے ایک ایک یا دو دو فقرے جمع کر کے سورہ فاتحہ کے ایک ایک لفظ کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔ پس ایک طرف یہ کہنا کہ سورہ فاتحہ آنحضرت کا انتخاب ہے۔ جو آپ نے بائبل سے کیا اور دوسری طرف اس انتخاب کی مثل میں موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم کا انتخاب پیش نہ کرنا اس بات کی زبردست دلیل ہے۔ کہ آنحضرت صلعم کا یہ بھی ایک معجزہ ہے۔ لہذا جس بات کو دشمن نے مذمت کے لئے پیش کیا تھا۔ اس میں بھی اس کے عقیدہ کے لحاظ سے مدح کا ہی پہلو نکل آیا۔ سچ ہے۔ ع

محمد ہست برہان محمد

(۳) اگر سورہ فاتحہ بائبل سے ماخوذ ہے۔ تو پھر سورہ فاتحہ عیسائی عقائد کی تردید کیوں کرتی ہے۔ سورۂ فاتحہ کا مسیحی معتقدات کی تغلیط کرنا اس امر کی پختہ اندرونی شہادت ہے۔ کہ سورۂ فاتحہ بائبل سے ماخوذ نہیں اور نہ ہی مسیحی صاحبان کا حق ہے کہ ایسا دعویٰ کریں۔

سورۂ فاتحہ اور انجیلی دُعا	انجیلی دعا جو یسوع مسیح نے اپنے حواریوں کو تلقین کی حسب ذیل ہے :-

"اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے۔ تیرا نام پاک مانا جاوے تیری بادشاہت آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے۔ زمین پر بھی ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور جس طرح ہم نے اپنے قرضداروں کو معاف کیا ہے۔ تو بھی ہمارے قرض ہمیں معاف کر اور ہمیں آزمائش میں نہ لا۔ بلکہ بُرائی سے بچا۔"

(متی ۶ : ۹ - ۱۳)

قرآن مجید فرماتا ہے :-

الحمد للہ رب العلمین۔ الرحمٰن الرحیم مالك یوم الدین

ایاك نعبد وایاك نستعین اھدنا الصراط المستقیم

صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین (الفاتحہ)

لفظی ترجمہ - اللہ ہی کے لئے سب خوبیاں اور تعریفیں ہیں۔ وہ سب جہانوں کا رب ہے۔ بے انتہا کرم کرنے والا۔ بار بار رحم کرنیوالا۔ اور جزا و سزا کے وقت کا مالک ہے۔ اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ تو ہی ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ اس پر چلا اور مداومت کی توفیق دے۔ حتی کہ ہم منزل مقصود تک پہنچ جاویں۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو انعام کر چکا ہے۔ ہاں ان کے راستہ سے بچائیو جو مورد غضب ہوئے اور گمراہ ہو گئے۔ آمین۔

ناظرین کرام! ہر دو دعاؤں کے الفاظ آپ کے سامنے ہیں۔ معمولی سے تدبر سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ کون سی دعا جامع، اکمل، ذات باری اور انسانی حالات کے مناسب ہے۔ دونوں میں صفاتِ الٰہی کا ذکر، انسانی اعمال اور

احتیاج کا ذکر ہے۔ حاضر الوقت مطالبہ کا بیان ہے۔ آئندہ خطرات سے بچانے
اور حفاظت کے لئے دعا کی گئی ہے۔ لیکن دونوں بیانات میں زمین و آسمان
کا فرق ہے۔ حسب ذیل امور سے اجمالی طور پر موازنہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱) انجیل اللہ تعالیٰ کو "اے ہمارے باپ" کہتی ہے قرآن مجید "رب العالمین"
ذکر کرتا ہے۔ انجیلی دعا مانگنے والا اول تو اللہ تعالیٰ کو باپ کہتا ہے اور وہ بھی
"ہمارا" کہہ کر اس ابوت کو اپنے دائرہ میں ہی محدود قرار دیتا ہے۔ قرآنی دعا کرنے
والا اسے رب اور پھر رب العالمین کہتا ہے۔ وشتان ما بینہما۔
باپ کا تعلق محدود۔ دائرہ تعلق محدود اور اس تعلق کے نتائج و اثرات بھی
محدود ہیں۔ اور باپ باپ بننے میں غیر کا محتاج ہے۔ یعنی جب تک اس کی
بیوی نہ ہو جو مولود کی ماں بن سکے باپ باپ نہیں بن سکتا۔ پس یہ لفظ
ذات باری کے تعلق کی حقیقی تعبیر نہیں۔ بلکہ ذرا سوچا جاوے۔ تو اس کی
توہین ہے۔ کہا جا سکتا ہے۔ کہ نسل انسانی کے ارتقاء کی ابتدائی منازل
میں اللہ تعالیٰ کا تصور قائم کرنے اور اس کی محبت کا نقشہ جمانے کے لئے
جس طرح ویدک دھرم میں ایشور کو ماں قرار دیا گیا ہے (ستیارتھ پرکاش باب ۱)
ایسا ہی انجیل نے اسے باپ کہہ دیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ نہ باپ
ہے نہ ماں ہے۔ بلکہ رب ہے۔ جو ارحم الراحمین ہے۔ اس کی ربوبیت ہر ذرہ
کو وجود بخشتی ہے۔ نشوونما دیتی ہے۔ مدارجِ ترقی میں سے گذار کر کمال
تک لے جاتی ہے۔ اس کا زمانہ تعلق غیر محدود۔ اس کا دائرہ تعلق غیر محدود
اور اس کے تعلق کے اثرات و ثمرات غیر متناہی۔ پس اصل اور صحیح طور پر اللہ
رب ہی ہے۔ ماں یا باپ نہیں۔ یہ استعارے ناقص اور عارضی تھے۔

انجیل "ہمارے باپ" کہہ کر دائرہ کو تنگ کرتی ہے۔ مگر قرآن مجید

"رب العالمین" کہہ کر اس کے دائرہ ربوبیت کو ما کان و مایکون سب پر حاوی بتلاتا ہے۔

(۲) انجیلی دعا کہتی ہے۔ "تو جو آسمان پر ہے" قرآن مجید اس کے لئے نہ آسمان معین کرتا ہے نہ زمین۔ بلکہ سورہ فاتحہ "رب العٰلمین" کہکر اُسے لا محدود اور ہر جگہ موجود بتاتی ہے۔ آسمان بھی "العالمین" میں سے ایک عالم ہے۔ خدا تعالےٰ اس کا بھی خالق ہے۔ اس لئے خدا تعالےٰ کو آسمان پر بتانے کے معنے یہ ہیں۔ کہ آسمان پر ہونے سے قبل اس کا کوئی اور محل تھا۔ ممکن ہے۔ کہ پادری صاحب اس جگہ جواب میں بائبل کی یہ آیت پڑھ دیں کہ "خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی" (پیدائش ۱/۲) لیکن یاد رہے کہ پانی پھر مخلوق ہے۔ اس طرح تو دور تسلسل شروع ہو جائیگا جو موجودات میں بالاتفاق محال ہے۔ بہر حال انجیلی دعا میں اللہ تعالےٰ کا محل مقرر کیا گیا ہے۔ اور سورہ فاتحہ نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ درحقیقت اس کی تردید کی ہے۔

(۳) انجیل کہتی ہے "تیرا نام پاک مانا جاوے" گویا خدا کا نام پاک نہیں مانا گیا۔ مگر سورۂ فاتحہ کہتی ہے "الحمد للہ" اللہ کے لئے ہی سب خوبیاں ہیں۔ اسی کی ذات تمام محامد کی سرچشمہ ہے۔ قرآن مجید دوسری جگہ فرماتا ہے:۔

وان من شیٔ الا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم (بنی اسرائیل ع ۵) کہ ہر چیز اللہ کی پاکیزگی کا گیت گا رہی ہے اور اس کی حمد کر رہی ہے۔ لیکن افسوس کہ تم اس حقیقت کو نہ سمجھنے کے باعث ابھی تک کم سمجھ ہو۔

"تیرا نام پاک مانا جاوے"۔ پس انجیل جس وصف کو ذات باری کیلئے
منتظر الوقوع بتلا رہی ہے۔ قرآن مجید اور خاص کر سورہ فاتحہ اس کے
واقعہ ہونے کی خبر دے رہی ہے۔

(۴) انجیل کہتی ہے کہ "تیری بادشاہت آئے"۔ گویا ابھی تک خدا کی
بادشاہت نہیں آئی۔ بادشاہت سے مراد اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کا نزول پُر اجلال ہے۔ جسے تورات نے خدا کی آمد (استثناء باب ۳۳) اور
حضرت مسیح نے باپ یا انگورستان کے مالک کی آمد قرار دیا ہے (متی ۲۱/۴۰)
تو یہ دعا پوری ہوگئی۔ مبارک وہ جو قبول کرے۔ اور اگر یہ ہے۔ کہ خدا
خود مجسم ہو کر زمین پر اُتر آوے۔ تو یہ غلط ہے۔ انجیل بھی کہتی ہے۔ کہ
خدا کی بادشاہت ظاہری طور پر نہ آئے گی (لوقا ۱۷/۲۰) ہاں اللہ تعالے
کی اصلی بادشاہت تو ذرہ ذرہ پر موجود ہے۔ اس کے آنے کے لئے
دعا مانگنا ایک سطحی خیال ہے۔ بہر صورت انجیلی دعا کا یہ فقرہ بھی تشریح
طلب ہے۔ اور مسیحی اصحاب کا بغیر سوچے اسے دہراتے چلے جانا زیادہ
مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

سورۂ فاتحہ اللہ تعالٰی کو رب العٰلمین کہہ کر ذرہ ذرہ پر اس کی
بادشاہت کا اعلان کر رہی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:۔ "وللّٰہ ملک
السمٰوات والارض" (الفتح) کہ ہر جگہ اللہ ہی کی بادشاہت ہے۔
پھر سورہ فاتحہ نے "مالک یوم الدین" کہہ کر بتا دیا۔ کہ جزا و سزا کے
وقت کا وہی مالک ہے۔ جزاء و سزا ور حالات کے لحاظ سے دنیا
میں بھی مترتب ہو رہی ہے۔ اور ہر لمحہ اس کے نتائج نکل رہے ہیں۔
اور قیامت کے روز کامل طور پر اس کا ظہور ہوگا۔ اس لئے اللہ تعالٰے

کی مالکیت ہر وقت کام کر رہی ہے۔ اور اس کی بادشاہت موجود ہے۔

(۵) حضرت مسیح کہتے ہیں "تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو" اس فقرہ کا اگر کوئی مطلب ہو سکتا ہے۔ تو صرف یہ کہ حضرت مسیح اور مسیحیوں کے نزدیک زمین پر خدا کی مرضی پوری نہیں ہوتی۔ اور یہ گمان یقیناً اللہ تعالیٰ کی ہتک ہے۔ کہ زمین پر اس کی مرضی پوری نہیں ہوتی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ زمین پر جو بھی ہو رہا ہے۔ سب اس کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ ملائکہ اپنے اختیار سے نیکی یا بدی پر قادر نہیں بلکہ وہ محض قوت خیر کے مظہر ہیں۔ اور انسان کو اللہ تعالےٰ نے نیکی اور بدی کی قوت دے کر۔ ہدایت اور ضلالت سے آگاہ کر کے آزادی بخشی۔ کہ وہ چاہے نیکی اختیار کرے چاہے بدی۔ نیکی کرنے کی صورت میں اجر کا مستحق ہوگا۔ بدی کی حالت میں سزا پائے گا۔ یہ آزادی اللہ تعالےٰ کی مرضی سے ہے۔ یقیناً سمجھو۔ کہ اللہ تعالےٰ کی مرضی کون و مکان کے ہر حصہ میں پوری ہو رہی ہے۔ کوئی نہیں جو اس کی مرضی کو پورا ہونے سے روک سکے۔ زمین کی کیا مجال ہے۔ کہ خدا کی مرضی اور اس کے ارادہ سے سرتابی کرے۔ سورۃ فاتحہ نے لفظ "رب العالمین" میں ان تمام اوہام کا رد کیا ہے۔ ایک اور جگہ پر اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ یسبح للّٰہ ما فی السمٰوات وما فی الارض الملک القدوس العزیز الحکیم (الجمعہ) آسمانوں اور زمین کا چپہ چپہ اللہ تعالےٰ کی مرضی کو پورا کر رہا ہے۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ انجیل نویسوں کو یہ خیال ہوا ہے۔ کہ شائد زمین پر خدا کی مرضی نہیں پوری ہو رہی ہے۔ بلکہ خدا اپنی مرضی منوانے سے عاجز اور شیطان غالب ہے۔ اس لئے انہوں نے اس دعا کی تلقین

کی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو دارالعمل بنایا ہے۔ اور انسان کو جبراً ہدایت اور گمراہی پر مجبور نہیں کیا۔ بلکہ اس کی نیت اور عمل میں اُسے آزاد بنایا ہے۔ تاکہ وہ اجر یا عذاب کا مستحق ہو۔ اور یہ سب کچھ اللہ کی مشیت اور اس کی مرضی سے ہوا۔ پس انجیل کی دعا بظاہر اللہ تعالےٰ کے عجز اور بباطن خالق ومخلوق کے تعلقات سے ناواقفی اور جبرواکراہ کی خواہش پر دلالت کرتی ہے۔ سورہ فاتحہ کہتی ہے کہ وہ **الرحمٰن** ہے اس لئے اس نے انسان کی بھلائی، بہبودی اور ترقی کے سب سامان مہیا کر دئے ہیں۔ اس کے مانگنے یا عمل کے بغیر بے پایاں احسان کئے ہیں۔ مگر ہدایت پر جبر نہیں کیا۔ اور نہ گمراہی پر مجبور کیا ہے کیونکہ وہ **الرحیم** ہے۔ وہ اعمال کا بہترین بدلہ دینے والا ہے۔ بار بار کرم کرنے والا ہے لہذا اس نے انسان کو میدان عمل میں آزاد فرمایا ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ سب کی ہدایت و بھلائی چاہتا ہے۔ مگر یہ بھی اسی کی مرضی ہے۔ کہ جبر سے ہدایت نہیں دیتا۔ پس جو کچھ زمین پر ہو رہا ہے اسی کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ وہ مرضی قوانین طبعیت سے تعلق رکھتی ہو یا قانون شریعت سے۔

(۱۳) انجیلی دعا کا انتہائی مطالبہ کیا ہے فرمایا "ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے"۔ سورۂ فاتحہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ "اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم"۔ "ہمیں اپنے تک پہنچنے کا سیدھا راستہ دکھائیے چلنے کی توفیق بخشئے۔ اور منزل مقصود تک پہنچائیے۔ ان لوگوں کے طریق پر جو تیرے انعامات کے مورد بنے"۔

دونوں مطالبوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ اول الذکر صرف روٹی مانگتا ہے

اور وہ بھی آج کی روٹی آج۔ مگر ثانی الذکر روٹی نہیں بلکہ کوچہ محبوب ازلی کا مختصر ترین اور جلد پہنچانے والا راستہ چاہتا ہے۔ اور آج پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ لانہایت اور غیر محدود قرب میں ترقی چاہتا ہے۔ کل یوم ھو فی شان۔

اگر کوئی صدق دلی سے اسی ایک فرق پر نظر کرے تو اُسے عیسائیت اور اسلام، انجیلی دعا اور سورہ فاتحہ میں فرق معلوم ہو سکتا ہے۔ جو نسبت روٹی اور صراط مستقیم میں ہے۔ وہی عیسائیت اور اسلام یا انجیلی دعا اور سورہ فاتحہ میں ہے۔ اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ جو چیز جس امت نے مانگی۔ اُسے وہی مقصود عطا کر دیا گیا۔ عیسائیوں کا مقصد روٹی تھی۔ سو وہ روٹی بافراط اور بکثرت حاصل کر رہے ہے۔ حتیٰ کہ انجیل کے اس واقعہ کی تصدیق ہو رہی ہے۔ جس میں لکھا ہے:۔

"ابلیس اُسے ایک بہت اونچے پہاڑ پر لے گیا۔ اور دنیا کی ساری بادشاہتیں اور ان کی شان و شوکت اسے دکھائی۔ اور اس سے کہا۔ کہ اگر تو جھک کر مجھے سجدہ کرے تو یہ سب کچھ تجھے دے دوں گا" (متی ۴/۸-۹)

مسلمانوں نے "صراط مستقیم" مانگا۔ اور نعمت الٰہی کی خواہش کی اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

"ومن یطع اللہ والرسول مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین و حسن اولئک رفیقاً (النساء) کہ ہاں اللہ تعالیٰ اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی پیرو نبوت۔ صدیقیت۔

اور صالحیت کے انعام سے ہمیشہ بہرہ ور ہوتے رہینگے"۔
چنانچہ واقعہ بھی ایسا ہی ہے۔ حکومت اور دولت ملتی اور زائل ہوتی ہیگی لیکن" صراط مستقیم" کی نعمت کبھی چھینی نہ جاوے گی۔ امت محمدیہ میں ہزارہا اولیاء اللہ ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ جن سے اللہ تعالیٰ ہمکلام ہوتا ہے۔ اور یہی امر امت محمدیہ کے فخر کے لئے بس ہے۔
(۷) انجیلی دعا میں کہا گیا ہے" جس طرح ہم نے اپنے قرضداروں کو معاف کیا ہے"۔ اس کے بالمقابل سورہ فاتحہ ایک مومن کے منہ سے کہلواتی ہیگی "ایاك نعبد" ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں۔ تجھ کو ہی اکیلا معبود سمجھتو ہیں۔ ہمارا معبود نہ دنیا ہے نہ دنیا کے باشندے۔ نہ نفسانی خواہشیں نہ ثواب کی آرزو۔ حتیٰ کہ نہ عمل خیر کو خیر قرار دینا ہمارا مقصود ہے۔ ہمارا معبود و مسجود صرف اور صرف تو ہے۔
انجیلی دعا میں "جس طرح" کہہ کر اپنی نیکی کو بحیثیت نیکی کے یاد دلایا ہے قرآنی دعا عجب و غرور کی بجائے تواضع اور فروتنی پر دلالت کر رہی ہے پھر فقرہ" ہم نے اپنے قرضداروں کو معاف کیا ہے۔ بھی قابل توجہ ہے فطرت گواہی دیتی ہے۔ کہ یہ فقرہ عبودیت کے مقام کے شایاں نہیں ہے۔ علاوہ اس کے کہ نیکی کو اس یقین اور شدت سے بارگاہ ایزدی میں پیش کرنا بھی درست نہیں ہے۔
اے بھائیو! بے تعصب ہو کر انجیل کے ان الفاظ اور قرآن مجید کے الفاظ" ایاك نعبد" پر غور کرو۔ تو تمہیں معلوم ہوگا۔ کہ روح پرور شیرینی اور دلکش جذب کن الفاظ میں ہے۔
(۸) انجیل سکھلاتی ہے"۔ تو بھی ہمارے قرض ہمیں معاف کر"۔ قرآن مجید

سورۂ فاتحہ میں کہنا ہے" وایاك نستعین" ہم صرف تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔تیری ہی اعانت کے طلبگار ہیں۔ انجیلی دعا کا قائل خدا کا قرض اس سے معاف کروانا چاہتا ہے۔یعنی ادائیگی حقوق میں جو قصور یا گناہ صادر ہوئے ہیں۔ وہ معاف کر دئے جائیں۔ مگر سورہ فاتحہ کے الفاظ" ایاك نستعین" میں بندہ اپنے اعمال کو کالعدم کرتا ہے۔جو خاکساری کا انتہائی مقام ہے۔گویا سورہ فاتحہ ہم سے اللہ تعالےٰ کے حضور یہ نہیں کہلواتی کہ ہم" ناکارہ مزدور" ہیں۔ بلکہ یہ کہ ہم تو حضور کے بندے ہیں ہم نے کچھ نہیں کیا۔حضور کی مدد۔اعانت اور نصرت کے طلبگار ہیں۔پھر انجیلی دعا میں قرض کی معافی ہے۔یعنی گناہ ساقط ہو جائیں۔جو سلب کا مقام ہے۔مگر سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی مدد طلب کی گئی ہے۔جو اعمال خیر کی انجام دہی کے لیے ممد و معاون ہو۔اور یہ مقامِ ایجاب ہے۔ از روئے قاعدہ اثبات نفی پر مقدم ہوتا ہے۔ وھوالمراد۔

اس جگہ یہ نکتہ قابل ذکر ہے۔کہ چونکہ انجیلی دعا" باپ" سے کی گئی ہے اور کئی بنئے صفت باپ ہیں۔جو بیٹوں کو کچھ دے کر" قرض" کے کھاتہ میں درج کر لیتے ہیں۔اور کئی تنگ ظرف بھائی اپنے باپ کے فرزندوں کو کچھ دیکر" قرض" سے موسوم کرتے اور پھر لوٹا کر یہ قرض باپ کے ذمہ ڈالتے اور اس پر احسان جتاتے ہیں۔یا کم از کم اس کے" قرض" میں مجرا دیتے ہیں۔اسی لئے انجیلی دعا میں خدا کا قرض۔بندوں کا بندوں پر قرض کا قصہ مذکور ہے۔ مگر سورہ فاتحہ کا مخاطب" رب العالمین" ہے۔اس لئے وہاں نہ اس کے قرض کا ذکر ہے۔نہ بندوں پر بندوں کے قرضہ کا قصہ ہے۔کیونکہ قرض تو دو مستقل بالذات ہستیوں میں واقع ہوا کرتا ہے۔ وہ ہمارا رب ہے۔

ہم اس کے بندے ہیں۔ ہماری ذات بھی اپنی نہیں تو قرض کیسا؟
عبد اور اس کی اشیاء اس کی نہیں۔ بلکہ آقا کی ہیں۔ تو قرضہ کیسا؟ ہاں
یہ اس کا مزید لطف و احسان ہوگا۔ کہ وہ رب العالمین سب کچھ عنایت کرے
مگر یہ نہ فرمائے کہ ہم نے تم پر احسان کیا ہے۔ بلکہ وہ بندوں کو کہے۔
کہ تم میری راہ میں خرچ کرو۔ واللہ الغنی وانتم الفقراء۔ میں اس
خرچ کو اپنے ذمہ قرار دیتا ہوں۔ کس قدر بندہ پروری اور ذرہ نوازی ہے
اپنے بے شمار اور بے انت احسانات کو اپنا قرض نہیں کہتا۔ بندوں کے
ذرا سے عمل کو جو سراسر اسی کی توفیق کا نتیجہ ہے اپنے ذمہ قرار دے رہا
ہے۔ اسی لئے کبھی کسی عارف کے منہ سے نہ سنوگے۔ کہ اے خدا میں
نے تجھے قرض دیا۔ یا تیرا میرے ذمہ قرضہ ہے۔ سبحان اللہ! قرآن پاک
کے ایک ایک انداز میں الٰہی محبت کا سمندر موجیں مارتا نظر آتا ہے ؎

کلام پاک یزداں کا کوئی ثانی نہیں ہرگز
اگر لولوئے عماں ہے وگر لعل بدخشاں ہے

(۹) انجیل کہتی ہے "ہمیں آزمائش میں نہ لا بلکہ بُرائی سے بچا" مگر سورہ
فاتحہ سکھلاتی ہے۔ صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب
علیھم ولا الضالین۔ ہمیں اپنے برگزیدوں کے راستہ پر چلا۔ اور
ان لوگوں کی راہ سے بچا۔ جو تیرے غضب کے مستحق بن گئے۔ اور جو گمراہ
ہو گئے۔

برائی سے بچنا اچھا ہے۔ مگر نعمت الٰہی حاصل کرنا اس سے بھی بڑھکر
ہے اور قابل فخر۔ فاتحہ کی دعا میں نعمت الٰہی مانگی گئی ہے۔ اور پھر اس
پر ملامت۔ کیونکہ ؎

اشد الغم عندی فی سرور + تیقن عنہ صاحبہ انتقالا

جس خوشی کے زائل ہو جانے کا انسان کو کامل یقین ہو۔ وہ حقیقی سرور کا موجب نہیں ہو سکتی۔ سورہ فاتحہ کے فقرہ غیر المغضوب علیہم و لا الضالین میں زوال نعمت سے پناہ اور دوام نعمت کی دعا کیگئی ہے۔

انجیلی دعا "آزمائش میں نہ لا" کہتی ہے۔ مگر قرآن مجید کہتا ہے کہ محبوب کے راستے میں دُکھ اور تکلیف کا کوئی سوال نہیں۔ آزمائشوں اور فتنوں کا کوئی خطرہ نہیں۔ عاشق صرف یہ کہے۔ کہ مجھے معشوق تک پہنچا دو اس کا راستہ بتا دو۔ فرمایا صراط الذین انعمت علیہم۔ سونا آگ میں ڈالے بغیر کندن نہیں ہو سکتا۔ سچے عاشق کی نظر میں پھولوں کا تاج اور کانٹوں کی سیج برابر ہوتے ہیں۔ فرمایا:۔

"ولنبلونکم بشیئ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات وبشر الصابرین (بقرہ ع ۱۹)

ہم ضرور تم کو کچھ خوف۔ بھوک۔ اموال۔ جانوں اور ثمرات کے نقصانات سے آزما دیں گے۔ لیکن صبر کرنے والے اور سچے عاشقوں کو مژدہ ہو۔ کہ وہ وقت میرے قرب پانے کا بہترین موقعہ ہے"

محبوب ازلی کے عشق کا دعویٰ اور دعا یہ کہ "آزمائش میں نہ لا"۔ عشقِ خدا نہ ہوا کھیل ہو گیا۔ مومن مصیبت اور آزمائش نہیں مانگتا۔ مگر وہ اس سے گھبراتا بھی نہیں۔ آؤ خدا کے ایک عاشق صادق بندے کا قول پڑھو ؎

در کوئے تو اگر سر عشاق را زنند
اوّل کسے کہ لافِ تعشق زند منم

اللہ تعالےٰ کی طرف آنے والوں پر مصائب و مشکلات اور کڑی آزمائشیں آتی ہیں۔ اور وہ ان کی ترقیٔ درجات کا موجب ہوتی ہیں۔ نیز وہ نااہلوں کے دعوے کو باطل کر دیتی ہیں۔ ؎

عشق اول سرکش و خونی بود + تا گریزد ہر کہ بیرونی بود

(۱۰) ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ انجیلی دعا میں اللہ تعالےٰ کی صفات، انسانوں کا مطالبہ اور انسانوں کا اللہ تعالےٰ سے تعلق جس طریق پر ذکر کیا گیا ہے۔ وہ سورۂ فاتحہ کے دلکش بیان کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ اس جگہ ہم یہ بتانا چاہتے ہیں۔ کہ دونوں دعاؤں میں جامعیت اور ترتیب کے لحاظ سے بھی فرق ہے۔ سورہ فاتحہ کی دعا ہر شخص پڑھ سکتا ہے۔ اس کے الفاظ جامع و مانع ہیں۔ لیکن انجیلی دعا صحیح طور پر وہ شخص ہی کر سکتا ہے۔ جو اپنے قرضداروں کو معاف کر چکا ہو۔ اور روٹی کا طالب ہو۔ پھر ترتیب طبعی یہ ہے۔ کہ اول اللہ تعالیٰ کی مناسب حمد ہو۔ پھر انسان اور خدا کے علاقہ کا ذکر ہو۔ پھر اپنی حاجات اور ضروریات کو پیش کیا جاوے۔ چنانچہ سورہ فاتحہ میں یہی طریق اختیار کیا گیا ہے۔ مالك یوم الدین تک صفات باری مذکور ہیں۔ آیت ایاك نعبد و ایاك نستعین خالق اور مخلوق کے رابطہ کو بیان کر رہی ہے۔ اھدنا الصراط المستقیم سے اخیر تک انسانی ضروریات کا تذکرہ اور دعا ہے۔ انجیلی دعا میں اول بعض ناقص صفات کا ذکر ہے۔ اور پھر روٹی کا مطالبہ ہے۔ بعد ازاں قرضداروں کے معاف کرنے کا قصہ ہے۔ اخیر پر "آزمائش میں نہ لا" کی آرزو ہے۔

اس مختصر سے مقابلہ سے ظاہر ہے کہ انجیلی دعا اور سورہ فاتحہ میں قریباً رات اور دن کا فرق ہے۔

اب عیسائی غور فرماویں۔ کہ حضرت مسیح کی بیان کردہ اور انتخاب کردہ دعا اور حضرت محمد مصطفیٰ صلعم کی وحی الٰہی سے فرمودہ دعا سورۂ فاتحہ ہمارے سامنے ہیں۔ اور مؤخرالذکر دعا بہر صورت اکمل و اشمل ہے۔ اگر ان کا یہ خیال صحیح فرض کر لیا جاوے۔ کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتخاب بائبل سے کیا ہے۔ تب بھی کہنا پڑے گا۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ سے بہر حال افضل و اعلیٰ تھے۔ کیونکہ یہ دونوں سورہ فاتحہ کے مقابلے کا کوئی انتخاب پیش نہیں کر سکے۔ اور حضرت مسیح نے جو انتخاب کیا اس کی حقیقت آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ عیسائی اصحاب ان حالات میں سورۂ فاتحہ کو خدا کا کلام مانیں یا بائبل سے منتخب شدہ کہیں۔ بہر حال یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بناوٹ نہیں ہے۔ اور سورۃ فاتحہ سے لازمی طور پر آنحضرت صلعم کی افضلیت حضرت مسیح علیہ السلام پر ثابت ہے۔ کیا عیسائی صاحبان غور کر کے اس نتیجہ سے اتفاق کرنے کے لئے تیار ہیں؟

سورۂ فاتحہ اور مسیحی معتقدات

جہاں تک ہیں نے غور کیا ہے سورہ فاتحہ میں اجمالی طور پر عیسائیوں کے تمام غلط عقائد کی تردید کی گئی ہے۔ اور وہ عقائد جو موجودہ عیسائیت کی جان ہیں۔ حسب ذیل ہیں:-

(۱) ابنیت مسیح۔ عیسائی صاحبان کا اعتقاد ہے کہ یسوع مسیح خود اِلٰہ اور خدا کا بیٹا تھا۔ اسلام اس عقیدہ کا مخالف ہے۔ کیونکہ اللہ کا بیٹا ہونے کے معنے یہ ہیں۔ کہ نعوذ باللہ اس کی ذات فنا پذیر ہے۔ کیونکہ کائنات عالم میں بھی بیٹا اور جانشین اسی چیز کا ہوتا ہے۔ جو اپنی ذات میں فانی ہو۔ اور جب تک اس جنس یا نوع کے باقی رکھنے کا ارادہ ہو۔ وہ ایک

ذات باقی نہ رہ سکتی ہو۔ لہٰذا اس کا بیٹا۔ ہیچ اور جانشین ہوتا ہے۔ لیکن جو ذات اپنی ضرورت تک بہ نفس نفیس موجود ہے۔ اس کا نہ بیٹا ہوتا ہے نہ اُسے بیٹے کی ضرورت ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ فنا سے پاک ہے۔ اور اسکو فانی کہنا سراسر باطل ہے۔ اس لئے قرآن مجید فرماتا ہے

تکاد السمٰوات یتفطرن منہ وتنشق الارض وتخر الجبال ھدًا ان دعوا للرحمٰن ولدًا (مریم)

قریب ہے کہ آسمان پھٹ جاویں اور زمین شق ہو جاوے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاویں۔ اس لئے کہ یہ لوگ خدائے رحمٰن کے لئے بیٹا پکار رہے ہیں۔ یعنی ابنیت مسیح کا عقیدہ نظام عالم کو درہم برہم کرنے والا ہے۔ اور یہ عقیدہ اللہ تعالیٰ کی شان بلند کے منافی ہے۔ سورہ فاتحہ کے لفظ "الحمد للہ" میں اس عقیدہ کی تردید موجود ہے۔ کیونکہ بیٹا ہونا ذات باری کے لئے مزیل شان ہے۔ اس سے شریک لازم آتا ہے جو "الحمد" میں بھی شریک ہوگا اور یہ امر الفاظ "الحمد للہ" کے خلاف ہے۔ نیز اللہ کا بیٹا ہونا اس کے فناء پر دلالت کرتا ہے۔ اور فنا ہونا کمزوری اور نقص ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر کمزوری اور نقص سے پاک ہے۔ پس مسیح کو ابن اللہ قرار دینا بھی باطل ہے غرض سورہ فاتحہ نے نہ صرف ابنیت مسیح کی تائید نہیں کی بلکہ تردید کی ہے۔

(۲) صلب مسیح۔ موجودہ عیسائیت کی بنیاد حضرت مسیح کی صلیبی موت پر ہے۔ نصاریٰ کا عقیدہ ہے۔ کہ یہودیوں کے ہاتھوں حضرت مسیح صلیبی موت مر گئے اور یہود کا یہ کہنا کہ مسیح صلیبی موت مر کر لعنتی ثابت ہوئے بھی درست ہے۔ مگر وہ ہمارے عوض میں لعنتی بنائے گئے۔ چنانچہ پولوس رسول لکھتا ہے :-

"مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لیکر شریعت
کی لعنت سے چھڑایا۔ کیونکہ لکھا ہے۔ کہ جو کوئی لکڑی پر لٹکایا گیا
وہ لعنتی ہے۔" (گلتیوں ۱۳/۳)

قرآن مجید نے **ماصلبوہ** میں حضرت مسیح کی صلیبی موت کی نفی کرکے
عیسائیت کی ریڑھ کی ہڈی کو توڑ دیا اور بل رفعہ اللہ الیہ میں حضرت
مسیح کو ملعون ہونے کی بجائے مرفوع الی اللہ اور مقرب بارگاہ بتاکر یہود و نصاریٰ
کی تردید کی۔ اور بتایا کہ لعنتی بننا۔ خدا کی درگاہ سے دھتکارا جانا مسیح کے
شایانِ شان نہیں۔ وہ منعم علیہم لوگوں میں سے تھا۔ اور لعنت اللہ اور نعمت الٰہی
ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ سورہ فاتحہ کی آیت صراط الذین انعمت
علیہم جو تمام انعام یافتہ انبیاء و صلحاء پر مشتمل ہے عیسائیوں کے
صلب مسیح کی تردید کر رہی ہے۔ کیونکہ مسیح دعویٰ نبوت کے بعد مصلوب
ہو جانے کی صورت میں لعنتی ثابت ہوتا ہے۔ (استثناء ۲۳/۲۱) پس
سورہ فاتحہ صلب مسیح کے بھی خلاف ہے۔

(۳) **تثلیث** ۔ عیسائی اقانیم ثلاثہ کے قائل ہیں۔ باپ خدا۔ بیٹا خدا
روح القدس خدا۔ ایک تین اور تین ایک۔ قرآن مجید نے اس کی
زبردست تردید کی ہے فرمایا لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث
ثلاثۃ (مائدہ رکوع ۱۰) وہ لوگ کافر ہیں جو خدا کو تین میں ایک قرار دیتے ہیں۔
سورۂ فاتحہ نے تین طور پر اس باطل عقیدہ کی تردید فرمائی ہے۔ (الف)
ذات میں اس کا کوئی شریک نہیں الحمد للہ (ب) صفات میں کوئی
اس کا ساجھی نہیں فرمایا رب العالمین۔ الرحمٰن۔ الرحیم۔ مالک یوم الدین
ذات باری واحد کے علاوہ سب اس کی مخلوق ہیں۔ وہ ان کا رب ہے۔

ان کا محسن ہے۔ ان کے اعمال کا محاسبہ کرنے والا ہے۔ اور مالکانہ جزاء
عطا کرنے والا ہے۔ چونکہ ذات احد کے سب محتاج ہیں۔ اس لئے جس طرح
ذات میں تعدد نہیں۔ اس کی صفات بھی متعدد افراد میں نہیں بانٹی جاتیں
(ج) عبادت وطلب اعانت میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ یعنی ہمارا معبود
اور مددگار ذات واحد کے سوا کوئی نہیں۔ خواہ وہ نبی ورسول ہی کیوں نہ ہو
اس لئے جبینِ مومن اللہ کے دروازہ پر ہی ناصیہ فرسا ہوگی فرمایا ایاک
نعبد وایاک نستعین تو ہی ہمارا معبود ومستعان ہے پس معلوم
ہُوا۔ کہ سورہ فاتحہ عقیدہ تثلیث کی بھی تغلیط کر رہی ہے۔

(۴) کفارہ۔ عیسائیوں کا خیال ہے۔ کہ حوا وآدم نے گناہ کیا۔ اس
لئے ہر بچہ گناہ گار پیدا ہوتا ہے۔ اور گناہ میراثی ہو یا ذاتی زید کا ہو یا بکر کا
ان سب کے عوض یسوع مسیح صلیب پر مر گیا۔ اور تین دن رات زیر لعنت
رہا۔ اس طرح سب مسیحی گناہ سے پاک ہو گئے۔ اور مسیح ان کے لئے
کفارہ ہو گیا۔

ہمیں اس جگہ یہ بحث کرنا مطلوب نہیں۔ کہ یہ عقیدہ عقل ونقل کے
خلاف ہے۔ اور واقعات اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ بلکہ صرف یہ اشارہ
کرنا مدنظر ہے۔ کہ سورہ فاتحہ نے عیسائیوں کے اس عقیدہ کی بھی تردید کی
ہے۔ اوّل تو صفات الٰہیہ ربّ۔ رحمٰن۔ رحیم اور مالک اس کے صریح
خلاف ہیں۔ کہ بالفرض اگر حضرت آدم نے گناہ کیا تھا۔ تو ہر بچہ گناہ گار پیدا ہو۔
یہ تو گونہ ظلم ہے۔ ربوبیت کا جسمانی اثر یہ ہے۔ کہ انسانی بچہ قانونِ قدرت کی
مراعات سے کامل الاعضاء پیدا ہوتا ہے۔ ربوبیت روحانی کا یہ نتیجہ ہے۔
کہ ہر روح جو خاص موہبت الٰہی سے پاکیزہ ہوتی ہے۔ اس کی استعدادات

ٹھیک اور لوح عمل صاف ہوتی ہے۔ دوم۔ آیت ایاک نعبد وایاک نستعین میں بتایا۔ کہ جب تک انسان خود اپنے اندر تغیر پیدا نہ کرے وہ عابد نہ بن جاوے۔ گناہوں سے حقیقی طور پر تائب نہ ہو مسیح کا کفارہ یا زید و بکر کی موت اسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ لاتزر وازرۃ وزر اخریٰ۔ کوئی جان کسی دوسری کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ ہاں اللہ تعالیٰ اپنے بعض مقرب بندوں کے اکرام کے طور پر ان کی شفاعت سے بعض گناہ معاف کرے گا۔ یہ شفاعت انہی لوگوں سے مخصوص ہوگی۔ جو اپنا پورا زور مار کر آسمانی بادشاہت میں داخل ہوتے ہیں۔ مگر بعض فروگذاشتیں اور لغزشیں سرزد ہو جاتی ہیں فرمایا۔ ماللظالمین من حمیم ولا شفیع (المومن ع ۲) لیکن اسصورت میں بھی گناہ گار کے گناہ کسی مقدس کے کندھے نہ لادے جائیں گے۔ اور اس کو لعنتی قرار نہ دیا جائے گا۔ پس سورہ فاتحہ مسئلہ کفارہ کا بھی ابطال کر رہی ہے۔

(۵) عیسائی صرف خاندان اسرائیل اور اس کے اوپر اسی نسب کے نبیوں پر ایمان لاتے ہیں۔ پولوس لکھتا ہے:۔

"وہ اسرائیلی ہیں۔ اور لے پالک ہونے کا حق اور جلال اور عہود اور شریعت اور عبادت اور وعدے انہیں کے ہیں۔ اور قوم کے بزرگ انہیں کے ہوئے ہیں۔ اور جسم کی رو سے مسیح بھی انہیں میں سے ہوا" (رومیوں ۹/۵)

قرآن مجید فرماتا ہے۔ ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت (النحل ع ۵) کہ ہم نے درس توحید کے دینے کے لئے ہر قوم میں رسول بھیجے ہیں۔ جو راہ حق کی تلقین کرتے تھے سورہ فاتحہ

بھی لفظ "رب العالمین" میں اسی حقیقت کا اظہار کر رہی ہے۔ کہ خدا صرف اسرائیل کا ہی رب نہیں۔ بلکہ رب العالمین ہے۔ اس نے جس طرح سیاہ و سفید مشرقی و مغربی سب کو اپنے ظاہری سورج سے منور کیا ہے اسی طرح ہر ملک اور ہر قوم کو روحانی سورج سے بھی بہرہ ور فرمایا ہے۔ ربوبیت روحانی میں اس نے کسی ملک یا قوم کو محدود نہیں کیا۔ بلکہ اس کا فیضان عام ہے۔ قطع نظر اس امر کے کہ قرآن پاک کا ہی عقیدہ انسانی فطرت و عقل کے مطابق اور دنیا کے امن کا ذریعہ ہے۔ یہ بالبداہت ثابت ہے۔ کہ سورہ فاتحہ عیسائیت کے اس تنگ نظریہ کی بھی کھلی کھلی تردید کر رہی ہے۔

(۶) گناہوں کی معافی اور عدل۔ عیسائی کہتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ بغیر سزا دئے کوئی گناہ معاف نہیں کر سکتا۔ ورنہ اس کا عدل ٹوٹ جائے گا۔ اسی بنا پر وہ یسوع مسیح کو خدا کا بیٹا اور سب عیسائیوں کے گناہوں کی سزا بھگتنے والا قرار دیتے ہیں۔ گویا وہ خدا تعالیٰ کو محض ایک جج تصوّر کرتے ہیں۔ کہ معاف کر دینا اس کے اختیارات سے باہر ہے۔ ہمیں یہ بحث نہیں۔ کہ اگر گنہ گار انسانوں کے گناہ معاف کر دینے سے عدل ٹوٹتا ہے اور عدل کا تقاضا ہے۔ کہ ان کو سزا دی جاوے۔ تو موجودہ صورت میں عدل اور رحم دونوں ٹوٹ گئے۔ عدل اس لئے کہ گناہ عیسائی کریں۔ اور سزا مسیح اٹھائیں۔ یہ کہاں کا عدل ہے۔ کہ مجرم زید ہو اور پھانسی بکر کو دے دی جاوے۔ رحم اس لئے کہ خدا باپ نے اپنے بے گناہ بیٹے کو نہایت بیدردی سے ذبح کرا دیا۔ یہ کہاں کا رحم ہے۔ کہ خود آرام میں رہا۔ اور بیٹے کو چیخنے چلانے اور ایلی ایلی لما سبقتنی کا واویلا کرنے کے باوجود موت کے گھاٹ اتار دیا جاوے۔ بابر تو ہمایوں کی موت مرتا ہے۔ مگر

اس جگہ باپ بیٹے کو سولی دے رہا ہے۔ یہ تو خیر عدل اور رحم کا قصہ ہے ہم اس جگہ یہ بتانا چاہتے ہیں۔ کہ سورۃ فاتحہ نے مسیحیوں کے اس باطل عقیدہ کی بھی تردید کی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ کو منصف نہیں بلکہ الرحمٰن اور الرحیم ذکر کیا ہے۔ اور "رحم عدل پر غالب آتا ہے"۔ برمحل رحم کرنے والے کو بے انصاف نہیں کہہ سکتے۔ اللہ کا رحم یہ ہے۔ کہ نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں سے زیادہ بدلہ دیتا ہے اور بدکاروں کو بدی سے زیادہ سزا نہیں دیتا۔ بلکہ گناہ معاف بھی کر دیتا ہے۔ سورہ فاتحہ اللہ تعالیٰ کو عادل کہنے کی بجائے مالک قرار دیتی ہے۔ اور مالک اپنی ملک میں تصرف کرنے میں ہر طرح آزاد ہے۔ خدا کو عادل کہنے والے اپنا حق اس پر ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن مالک کہنے والا اپنا کوئی حق نہیں سمجھتا۔ کیونکہ مملوک کا مالکِ حقیقی پر کوئی حق نہیں ہو سکتا۔ پھر عادل کہنے والا خدا کے اختیارات دگناہوں کے معاف کرنے اور نیکی کا بڑھ کر بدلہ دینے وغیرہ کو محدود قرار دیتا ہے۔ مگر مالک کہنے والا اسے متصرف کلی قرار دے کر رحمت کا امیدوار ہوتا ہے۔ غور فرمائیے ان دونوں خیالات میں کتنا فرق ہے؟

پادری ایس ایم پال صاحب لفظ مالک پر لکھتے ہیں:۔

"مالک کے معنے ہیں۔ کہ اپنی مملوکہ اشیاء میں جس طرح چاہے تصرف کرے تفسیر بیضاوی ص۲۸ پس آریوں کے نزدیک خدا کسی چیز کا بھی مالک نہیں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی مملوکہ اشیاء میں جیسا چاہے ویسا تصرف نہیں کر سکتا ہے مثلاً وہ مادہ اور روح کو نہ تو پیدا کر سکتا ہے۔ اور نہ نیست کر سکتا ہے۔ بلکہ ان کی کسی صفت کو تبدیل بھی نہیں کر سکتا" (ص۲۲

میں کہتا ہوں - کہ مالک اپنی مملوکہ اشیاء کی خطاؤں کو معاف کر کے ان کی نیکیوں کا زائد بلکہ غیر محدود بدلہ دے سکتا ہے - اور اندریں صورت نہ صرف یہ لفظ آریہ کی تردید ہے - بلکہ عیسائیت کے عقیدہ پر بھی تبرّہ ہے۔

(۷) ابدی دوزخ - عیسائی ایمان رکھتے ہیں - کہ گناہ گار ایک دفعہ دوزخ میں پڑنے کے بعد کبھی نکالے نہ جائیں گے - انجیل میں لکھا ہے :-

"اے ملعونو! میرے سامنے سے اس ہمیشہ کی آگ میں چلے جاؤ - جو ابلیس اور اس کے فرشتوں کے لئے تیار کی گئی ہے" (متی ۲۵/۴۱)

اسلام دوزخ کو آخر کار محدود مانتا ہے - یعنی ایک لمبے عرصہ کے بعد دوزخی دوزخ سے نکالے جائیں گے - کیونکہ دوزخ بمنزلہ ہسپتال کے ہے - سورہ فاتحہ میں لفظ رب اور مالک میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی مجرموں کی سزا انتقامی نہیں - بلکہ اصلاحی ہوگی - اور مالکیت کے ماتحت یہ بھی ضروری ہے - کہ آخر وہ دوزخ سے نکال دیئے جائیں - تاکہ پیدائش کی اصل غرض پوری ہو کہ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

(۸) عصمت انبیاء - عیسائی عقیدہ کی رُو سے سب نبی گناہ گار تھے - اللہ کے نافرمان تھے - چور تھے زانی تھے دھوکہ باز تھے (نعوذ باللہ من ہٰذہ الخرافات)

مگر سورہ فاتحہ لفظ "انعمت علیھم" میں اس کی تردید کر رہی ہے اور بتا رہی ہے - کہ وہ لوگ بد اخلاق نہ تھے - گناہ گار نہ تھے - بلکہ محبوبانِ بارگاہِ خدا تھے - اس کی نعمت کے وارث بنے - اور ان کا محبوبانِ ربانی ہونا ہی اس بات کی زبردست دلیل ہے کہ وہ مقدس و مطہر تھے -

پاک ہو جاؤ کہ وہ شاہ جہاں بھی پاک ہے
جو کہ ہو ناپاک دل اس سے نہیں کرتا وہ پیار

(۹) **مسیحی معجزات** - عیسائیوں کا خیال ہے کہ تورات وغیرہ میں دیگر انبیاء علیہم السلام کے مذکورہ معجزات اور حضرت مسیح کے معجزات میں یہ فرق ہے - کہ نبیوں کے معجزات اللہ تعالےٰ سے دعا اور عجز کے سبب ظاہر ہوتے تھے - اور مسیح کے معجزات اقتداری تھے - اور اسی خیال کی بناء پر وہ مسیح کو خدا تصور کر بیٹھے ہیں -

اگرچہ یہ ادعاء انجیلی بیانات اور واقعات سے ثابت نہیں ہو سکتا بلکہ انجیل بار بار کہتی ہے - کہ مسیح اللہ تعالےٰ سے دعائیں کرتا اور راتوں کو رو رو کر عاجزی کیا کرتا تھا - (لوقا $\frac{۲۲}{۳۵-۴۴}$) اور اقتدار کا یہ عالم ہے - کہ یہودیوں نے صلیب پر لٹکا دیا - خیر یہ تو ایک لمبی بحث ہے - سورہ فاتحہ ہر ولی اور نبی بلکہ خاتم النبیین صلعم کے منہ سے بھی کہلواتی ہے - "ایاک نستعین" - اے خدا تیری مدد و اعانت کے بغیر ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے - جس کے دوسرے لفظوں میں یہ معنے ہیں - کہ کسی نبی کے معجزات بھی اقتداری نہ تھے - حضرت مسیح بھی منجملہ نبیوں کے ایک نبی ہیں - پس سورۃ فاتحہ نے اس عقیدہ کی بھی تردید کر دی -

(۱۰) **مسیح کی آمد ثانی** - یہود کو ایلیا کی آمد ثانی کا وعدہ دیا گیا تھا - مگر انہوں نے ٹھوکر کھائی - روحانیت کی باریکیوں پر غور نہ کیا اور یسوع مسیح کے اس قول کو تسلیم نہ کیا - جو آپ نے حضرت یحیٰی علیہ السلام (یوحنا) کے متعلق فرمایا تھا کہ :-

" چاہو تو مانو ایلیاہ جو آنے والا تھا یہی ہے - جس کے سُننے

کے کان ہوں وہ سُن لے" (متی ۱۱/۱۴)

عیسائیوں کا اعتقاد ہے کہ حضرت مسیح آسمان سے دوبارہ بذات خود آئیں گے۔ اور وہ ان کی جسمانی آمد ثانی کے منتظر ہیں۔ لیکن سورہ فاتحہ ان کے اس زعم کو بھی باطل کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ امت محمدیہ کو دعا سکھلاتا ہے۔ اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم۔ جو انعام تو نے پہلوں پر کئے وہ ہم پر بھی کر۔ اللہ تعالےٰ کا یہ دعا سکھلانا اس بات کو مستلزم ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ امت محمدیہ کو وہ تمام نعمتیں دینی چاہتا ہے۔ جو اس نے پہلوں (بنو اسرائیل) کو دیں۔ بلکہ ان سے بڑھ کر۔ کیونکہ یہ خیر امت ہے۔ فرمایا وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم (النور) اللہ تعالےٰ نے مومنوں سے وعدہ فرمایا ہے۔ کہ ان کو اسی طرح خلفار بنائے گا جس طرح پہلوں کو بنایا۔ امت بلحاظ امت کے۔ اور افراد بلحاظ افراد کے۔ غرض جس طرح حضرت موسےٰ کے بعد چودھویں صدی میں حضرت مسیح بنو اسرائیل کی ہدایت کے لئے مامور ہوئے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چودھویں صدی میں مسیح محمدی دنیا کی اصلاح کے لئے مبعوث ہونگے۔ بالفاظ دیگر مسیح موعود امت محمدیہ کا ایک فرد ہے نہ کہ اسرائیلی نبیوں میں سے ایک نبی۔ (امامکم منکم) پس سورہ فاتحہ عیسائیوں کے اس اعتقاد کی بھی تغلیط کر رہی ہے۔ کہ کسی زمانہ میں حضرت مسیح ابن مریم اسرائیلی رسول جسمانی طور پر دوبارہ تشریف لائیں گے۔ تلک عشرۃ کاملۃ۔

کیا کوئی عیسائی یہ گوارا کرنے کے لئے تیار ہے کہ ابنیتِ مسیح

صلیب مسیح ۔ تثلیث ۔ کفارہ ۔ انبیاء اسرائیلی فقط ۔ گناہوں کی عدم معافی دوزخ کی ابدیت ۔ عدم معصومیت انبیاء ۔ مسیح کے اقتداری معجزات اور مسیح کی جسمانی آمد ثانی وغیرہ مسیحی عقائد کا انکار کرے ۔ اگر نہیں ۔ تو اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو ان عقائد کو غلط ۔ باطل اور جھوٹ سمجھو ۔ یا پھر اس وہم کو ترک کردو کہ سورہ فاتحہ بائبل سے ماخوذ ہے ۔ ؏

من نہ گویم کہ ایں مکن آں کن

مصلحت بین و کار آساں کن

ان بیانات سے ظاہر ہے ۔ کہ سورہ فاتحہ کو بائبل کی نقل بتانا محض ایک طفلانہ خیال ہے ۔ اور امیہ بن ابی الصلت کو اس ترغیب کا محرک کہنا محض کم علمی ہے ۔ ان حالات میں کوئی عقل مند اور محقق عیسائی بھی پادری پال صاحب کے زعم فاسد کی تائید نہیں کرسکتا :

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

باب پنجم

پادری پال صاحب کے اعتراضات کے جواب

ہم نے باب چہارم میں پادری صاحب کے اعتراض کا اصولی جواب اور ان کے دعویٰ کی مکمل تردید کی ہے۔ اس جگہ ہم ان کے دیگر جملہ اعتراضات کا بفضلہ تعالےٰ جواب لکھتے ہیں۔ جو انہوں نے سورہ فاتحہ کے متعلق کئے ہیں۔

سورۂ فاتحہ کا جائے نزول

پادری پال صاحب لکھتے ہیں :-

"فاتحہ جیسی عظیم الشان سورت کی جائے نزول میں اختلاف ہونا فی الحقیقت ازبس حیرت انگیز امر ہے۔ علی الخصوص جب ہم یہ دیکھتے ہیں۔ کہ مورخین قرآن اس کی ایک نہایت معمولی اور چھوٹی سے چھوٹی آیت کی جائے نزول پر نہ صرف انگلی رکھ کر بتلاتے ہیں۔ بلکہ اس کا دن میں یا رات میں نازل ہونے، زمستان میں یا تابستان میں اترنے سفر میں یا حضر میں وارد ہونے وغیرہ ذالک کو نہایت وضاحت کے ساتھ بتلاتے ہیں۔" (صلہ)

الجواب۔ (۱) یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ قرآن مجید کی حفاظت جس بے نظیر رنگ میں ہوئی ہے اس کی مثال موجود نہیں۔ پادری صاحب نے

بھی خواہ ان کی نیت کچھ ہی ہو۔ قرآن مجید کی تاریخی عظمت کا اعتراف اور
اظہار کیا ہے۔ محققین یورپ کا بھی غیر معمولی حفاظتِ قرآن پر اتفاق ہے
سر ولیم میور نے لکھا ہے :-

" اس بات کی پوری پوری اندرونی اور بیرونی ضمانت موجود
ہے۔ کہ قرآن اب بھی اسی صورت و شکل میں ہے۔ جیسا کہ
وہ محمد صلعم کے وقت میں تھا" پھر لکھتے ہیں :-

" مسلمانوں کے قرآن کا ہماری اناجیل کے ساتھ مقابلہ کرنا جو
بد قسمتی سے بہت کچھ محرف و مبدل ہو چکی ہیں دو ایسی چیزوں
کا مقابلہ کرنا ہے۔ جن کو ایک دوسرے سے کوئی بھی مشابہت
نہیں " پھر اسی ضمن میں لکھتے ہیں :-

" اس بات کی مضبوط ترین شہادت موجود ہے کہ مسلمانوں
کا قرآن محمد صلعم کے وقت سے لے کر آج تک غیر محرف و
مبدل رہا ہے " (دیکھو دیباچہ لائف آف محمد مصنفہ سر ولیم میور)

جرمنی کا مشہور ترین مستشرق پروفیسر نولڈیک لکھتا ہے :-

" آج کا قرآن بعینہٖ وہی ہے۔ جو صحابہ کے وقت میں تھا"
نیز لکھتا ہے :- "یورپین علماء کی یہ کوشش کہ قرآن میں کوئی تحریف
ثابت ہو سکے قطعاً ناکام رہی ہے" (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا)

اب قابل غور امر یہ ہے۔ کہ قرآن مجید کی محفوظیت اور قطعیت کے
یقینی اور ناقابل تردید شواہد و دلائل کی موجودگی میں اگر کسی مفسر کا سورۂ فاتحہ
کے جائے نزول کے متعلق اختلاف ہو۔ تو اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا
کہ سورۂ فاتحہ بائبل سے ماخوذ ہے ؟

(۲) مقامِ نزول میں اختلاف ہونا ایک اجتہادی بات ہے۔ اس پر پادری صاحب کا یہ لکھنا کہ :-

"اس کی (سورہ فاتحہ کی) جائے نزول لکھنے تک کا کوئی مورخ راضی نہ ہو"

صریح غلط بیانی ہے۔ کیونکہ ان کا اختلاف خود بتا رہا ہے۔ کہ ہر ایک مورخ نے "جائے نزول" ضرور ذکر کی ہے۔ ورنہ اختلاف کیسا؟ لیکن یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ محلِ نزول نہ قرآن مجید کی جزء ہے نہ اس میں داخل ہے۔ اور نہ ہی اس میں علماء کے اختلاف سے قرآن مجید پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے۔

(۳) پادری صاحب نے زیر بحث عبارت میں یہ ظاہر کرنیکی کوشش کی ہے۔ کہ گویا قرآن پاک کی سورتوں اور آیات میں سے کسی کے مقامِ نزول میں علماء کا اختلاف نہیں فقط سورہ فاتحہ کے متعلق اختلاف ہے اس لیئے یہ اختلاف پادری صاحب کے نزدیک اس امر کی دلیل بن گیا۔ کہ سورہ فاتحہ بائبل سے ماخوذ ہے۔ حالانکہ یہ بیان محض مغالطہ ہے! کہ جس طرح دیگر متعدد سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے میں بعض رواۃ اور مفسرین کا اختلاف ہوا ہے۔ ویسا ہی سورۂ فاتحہ کے متعلق ہے ۔ لا اقل ولا اکثر من ذالك۔

سورۂ یونس۔ سورہ رعد۔ سورہ حج۔ سورہ فرقان۔ سورہ ص۔ سورہ محمد سورہ حجرات۔ سورہ حدید۔ سورہ تغابن۔ سورہ ملک۔ سورہ انسان وغیرہا کے متعلق بھی کم و بیش علماء میں اختلاف ہے۔ کہ یہ مکیہ ہیں یا مدنیہ۔

(ملاحظہ ہو اتقان جلد ۱ ص ۱۲-۱۳)

پس محض مفسرین کا اختلاف دیکھکر یہ وہم کر لینا۔ کہ سورہ فاتحہ داخلِ قرآن نہیں ایک نہایت ہی رکیک اور عامیانہ استدلال ہے اور پھر اس

سے یہ سمجھ لینا کہ سورہ فاتحہ بائبل سے ماخوذ ہے۔ اس قدر ثقاہت سے گری ہوئی بات ہے کہ کسی عقلمند کے مُنہ سے سنتے ہوئے بھی ہمیں شرم آتی ہے۔

(۴) یہ درست ہے کہ سورہ فاتحہ کے مکیہ یا مدنیہ ہونے کے متعلق اختلاف ہے۔ مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ سورہ فاتحہ کا مکی ہونا قریباً طے شدہ مسئلہ ہے۔ اور جن لوگوں نے اسے مدنی قرار دیا ہے۔ ان کا قول مرجوح اور موؤل ہے۔ مندرجہ ذیل ثبوت اس ضمن میں توجہ سے پڑھے جائینگے

اوّل۔ سورۃ الحجر بالاتفاق مکیہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ولقد اٰتینٰک سبعا من المثانی والقرآن العظیم ہم نے تجھ کو السبع المثانی اور قرآن عظیم دیا ہے اور السبع المثانی کی تفسیر میں آنحضرت صلعم فرماتے ہیں۔ "الحمد للہ رب العالمین ھی السبع المثانی والقراٰن العظیم الذی اوتیتہ"۔ (بخاری کتاب التفسیر) کہ سورہ فاتحہ ہی السبع المثانی اور قرآن العظیم ہے جو مجھے دیا گیا"۔ لہذا ماننا پڑیگا کہ سورہ فاتحہ یقیناً مکی ہے۔

دوم۔ سب مورخ اس پر متفق ہیں۔ کہ نماز مکہ میں فرض ہوئی۔ اور نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھا جانا ضروری ہے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے۔ لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب۔ اب اگر مکی زندگی میں نماز بغیر فاتحہ پڑھی جاتی رہی۔ تو ایک عجیب اور قابل ذکر امر تھا۔ مگر اس کا نشان تک روایات میں موجود نہیں۔ یہ ایک پختہ دلیل ہے۔ کہ سورہ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔

سوم۔ ثعلبی اور واحدی نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کے یہ الفاظ روایت کئے ہیں۔ کہ "نزلت فاتحۃ الکتاب بمکۃ من کنز تحت العرش"

یعنی سورہ فاتحہ مکہ میں اتری اور وہ عرش ربانی کے خزانہ میں سے ہے (اتقان جلد ۱ صـ۱۲) یہ ایک صریح روائت ہے

چہارم ۔ امام بیہقی اور واحدی نے عمرو بن شرجیل سے روائت کی ہے ۔ جس میں مذکور ہے ۔ کہ آنحضرت صلعم اور حضرت ابوبکر حضرت خدیجہ کے کہنے پر ورقہ بن نوفل کے پاس گئے ۔ آنحضرت صلعم نے اپنے حالات کا ذکر کیا اور کہا ۔ کہ میں اپنے پیچھے سے یا محمد یا محمد کی آواز سنتا ہوں مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے ۔ ورقہ نے کہا کہ آپ ثابت قدم رہ کر آواز سنیں اور پھر مجھے اطلاع دیں ۔ روائت کے آخری الفاظ یہ ہیں :-

" فلما خلا ناداہ یا محمد قل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
الحمد للہ رب العالمین حتیٰ بلغ ولا الضالین "

کہ جب آنحضرت تنہائی میں ہوئے ۔ تو جبرائیل نے آواز دی ۔ کہ اے محمد صلعم یوں کہو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تا الحمد للہ رب العلمین الخ

(اتقان جلد ۱ صـ۲۴ تفسیر کبیر جلد ۱ صـ۹)

اس روائت سے بھی صاف ظاہر ہے کہ سورہ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی تھی ۔

پنجم ۔ جابر بن زیدؓ نے مکی سورتوں کے جو اسماء ذکر کئے ہیں ۔ ان میں سورہ فاتحہ بھی ہے ۔ (اتقان جلد ۱ صـ۲۵)

ششم ۔ اکثر علماء کا یہی اعتقاد ہے ۔ کہ سورہ فاتحہ مکیہ ہے ۔ ثعلبی کہتے ہیں :" وعلیہ اکثر العلماء " (کبیر جلد ۱ صـ۹) مجاہد کے قول " فاتحۃ الکتاب انزلت بالمدینۃ ۔" پر ابن الفضل کہتے ہیں ۔ " لکل عالم ھفوۃ وھذہ ھفوۃ مجاھد لان العلماء علیٰ خلافہ " (کبیر حوالہ مذکور) ہر عالم سے لغزش ہو جاتی ہے اور یہ قول مجاہد کی لغزش ہے کیونکہ علماء اس

کے خلاف ہیں"۔ غور فرمائیں کہ اگر ہم کو مفسرین کے قول پر ہی فیصلہ کرنا ہے تو اکثریت کا قول لینا چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ سورہ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی۔

ہفتم - عقلی طور پر بھی سورہ فاتحہ کا مکی ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ سورہ فاتحہ ام الکتاب ہے۔ اور قرآن مجید کے لئے بمنزلہ متن اور متن شرح سے پہلے۔ ماں اولاد سے پہلے ہوتی ہے۔ پس قاعدہ "النواۃ ام النخلۃ" کے مطابق بھی ضروری ہے۔ کہ سورہ فاتحہ یقینی طور پر مکی ہو۔ وہوالمراد

ہشتم - اگر ذرا تدبر کیا جاوے تو اختلافی اقوال میں بآسانی تطبیق دی جا سکتی ہے۔ امام فخرالدین رازی نے تین قول نقل کئے ہیں۔ (۱) اکثریت کا قول کہ مکہ میں نازل ہوئی (۲) مجاہد کا خیال کہ مدینہ میں نازل ہوئی (۳) "بعض العلماء" کا قول کہ سورہ فاتحہ دو مرتبہ نازل ہوئی۔ اول مکہ میں اور دوبارہ مدینہ میں۔

اول الذکر اور موخر الذکر دونوں قول سورہ فاتحہ کا نزول مکہ معظمہ میں بتلاتے ہیں۔ صرف ایک شخص مجاہد کا قول سورہ فاتحہ کے مکیہ ہونے کے خلاف رہ جاتا ہے۔ اور اس کی علماء نے تردید کی ہے۔ غرض اس سے ظاہر ہے۔ کہ سورہ فاتحہ کے مکیہ ہونے پر صحابہ کا اجماع ہے۔ تابعین بجز مجاہد کے اس سے متفق ہیں۔ لیکن پادری پال صاحب رٹ لگا رہے ہیں۔ کہ سورہ فاتحہ کا مقام نزول ہی معلوم نہیں۔ افسوس تعصب علم وعقل کا ستیاناس کر دیتا ہے۔

ان شواہد مندرجہ بالا سے ظاہر ہے۔ کہ سورہ فاتحہ یقینی طور پر مکی سورت ہے۔ اس امر کے ثابت ہو جانے سے پادری صاحب کے اس زعم کی مزید تردید ہو جاتی ہے۔ کہ آنحضرت صلعم نے امیہ بن ابی الصلت کے شعر سن کر بائبل کی

طرف توجہ کی ہوگی۔ اور وہاں سے سورہ فاتحہ اخذ کرلی ہوگی۔
پادری صاحب کو اگر کسی جگہ اختلاف دیکھنا ہو تو پادری عماد الدین
کی حسب ذیل عبارت پڑھیں:۔
"اس بات میں اختلاف ہے۔ کہ اس (متی) نے (یہ انجیل)
کس زبان میں لکھی۔ آیا عبرانی میں یا یونانی میں" (دیباچہ تفسیر انجیل متی ص۵)

ایک علمی خیانت

سورہ فاتحہ کے محل نزول کے ذیل میں پادری صاحب لکھتے ہیں:۔

"ابو اللیث سمرقندی اپنی تفسیر میں ...... لکھتے ہیں۔ کہ آدھی
مکہ میں اور آدھی مدینہ میں نازل ہوئی۔ (تفسیر کبیر جلد اول ص۹۱
و اتقان فصل فی تحریر سورۃ المختلف فیہا ص۱۲)" ص۳

پہلی خیانت تو یہ ہے۔ کہ آپ نے ابو اللیث کے بیان کے لئے تفسیر کبیر
جلد ا ص۹۱ کا حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ اس جگہ امام رازی نے ابو اللیث کا نہ نام لیا
ہے اور نہ ہی اس قول کا ذکر کیا ہے۔ یہ صریح غلط بیانی ہے۔ دوسرے
ظاہری مطلب آپ کی تحریر کا یہ ہے۔ کہ گویا ابو اللیث کا یہ اپنا مذہب ہے
حالانکہ یہ بھی صحیح نہیں۔ امام سیوطی نے اتقان ص۱۲ پر اسکو یوں ذکر کیا ہے:۔

"وفیہا قول رابع انہا نزلت نصفین نصفہا بمکۃ
ونصفہا بالمدینۃ حکاہ ابو اللیث السمرقندی"

یعنی سورہ فاتحہ کے متعلق چوتھا قول بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ سورہ فاتحہ آدھی مکہ
میں اور آدھی مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس قول کو ابو اللیث السمرقندی نے حکایت کیا ہے
امام سیوطی اسے ابو اللیث کا قول نہیں بلکہ صرف اس کا حکایت کردہ
بتاتے ہیں۔ وبینہما ما ترای۔

امام سیوطی نے اس قول کے متعلق لکھا ہے :۔

"ولادلیل لھذا القول" یعنی یہ قول محض بے دلیل ہے (اتقان جلد ۱ صفحہ ۱۴)

پس یہ قول بے ثبوت اور بے بنیاد ہے۔ بلکہ اس کا قائل بھی مجہول ہے نیز عقل و درایت کی رو سے بھی بالکل ساقط الاعتبار ہے۔ لطف یہ کہ سورہ فاتحہ کی سات آیات ہیں ان کا بلحاظ الفاظ نصف ہو ہی نہیں سکتا۔ قائل کا یہ کہنا کہ سورہ فاتحہ نصف مکہ میں اور نصف مدینہ میں اتری۔ خود سورہ فاتحہ کے بھی خلاف ہے۔ پادری پال کا اس قول متروک و مجہول پر بنیاد قائم کرنا صاف بتا رہا ہے۔ کہ محض باطل پرستی ان کا شیوہ ہے۔ تحقیق سے ان کو کوئی واسطہ نہیں۔

سُورہ فاتحہ اور مصحف ابن مسعودؓ

پادری صاحب نے دوسرا اعتراض یوں کیا ہے :۔

(۱) "علماء علم اصول نے قرآن کی ہر ایک آیت قرآنی ثابت کرنے کے لئے یہ قانون مقرر کیا ہے۔ کہ جو کچھ قرآن میں ہے۔ ان سب کو تواتر کے ساتھ ثابت ہونا چاہیئے۔ اور اگر تواتر کے ساتھ ثابت نہ ہو سکے۔ تو وہ ہرگز قرآن کا جز نہیں ہو سکتا۔" (ص ۵)

(۲) "ابن اشتہ نے ابن مسعود کے قرآن کی تعداد و ترتیب سور بتلا کر کہا کہ ولیس فیہ الحمد ولا معوذتان یعنی ابن مسعود کے قرآن میں الحمد اور معوذتین نہیں ہیں (اتقان ص ۶۴)" ص ۳

(۳) "یقیناً سورہ فاتحہ کو قرآن سے خارج کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اس کی نقل میں تواتر نہیں ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے۔ کہ اگر اس کی نقل میں تواتر ہوتا۔ تو عبداللہ بن مسعود اس کو اپنے قرآن سے

خارج نہ کرتے۔ اگر خبر واحد کی بناء پر اس کو قرآن کا جزو تسلیم کیا جائے۔ تو قرآن ہمارے کا سارا ظنی اور مشتبہ ہو جائیگا کیونکہ خبر واحد سے بجز اس کے کہ ظن کو فائدہ پہنچے۔ درجہ یقین کو کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا ہے۔ اندریں صورت بعض شیعوں کا یہ کہنا کہ قرآن میں تغیر و تبدل واقع ہوا ہے صحیح ثابت ہوگا" (ص۶)

(۴) "دنیائے اسلام میں کوئی شخص اس کا جواب نہیں دے سکتا ہے۔ کہ عبداللہ بن مسعود جیسے جلیل القدر صحابی اور حافظ قرآن نے الحمد و معوذتین کو کیوں قرآن سے خارج کر دیا تھا" (ص۴)

سُورہ فاتحہ اور تواتر

پادری صاحب کہتے ہیں۔ کہ سورہ فاتحہ کی نقل میں تواتر نہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ "اگر اس کی نقل میں تواتر ہوتا۔ تو عبداللہ بن مسعود اس کو اپنے قرآن سے خارج نہ کرتے"۔ سوال یہ ہے۔ کہ کیا تواتر کے معنی یہ ہیں۔ کہ عبداللہ بن مسعود روایت کریں؟ یقیناً نہیں۔ بلکہ تواتر کے معنی یہ ہیں۔ کہ اتنے راوی روایت کریں۔ جن کے کذب پر اتفاق کر لینے کو عقل محال قرار دے منطقی کہتے ہیں:

"المتواترات وھی قضایا یحکم بھا بواسطۃ اخبار جماعۃ یستحیل العقل تواطؤھم علی الکذب" (مرقاۃ ص۲۵)

اصولی کہتے ہیں:۔

"الکثرۃ احد شروط التواتر بان تکون العادۃ قد احالت تواطؤھم علی الکذب" (شرح نخبۃ الفکر ص۴)

سورہ فاتحہ کے قرآن مجید کی جزء ہونے پر تمام صحابہ اجماع کرتے ہیں۔ آنحضرت صلعم کی احادیث نقل کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ مغربی مصنف بھی سورہ فاتحہ

کے متواتر النقل ہونے کا اقرار کر رہے ہیں۔ مگر پادری پال صاحب کے
نزدیک ہزارہا صحابہ کا نقل کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیونکہ یہ بقول ان کے
"خبر واحد" ہے۔ اکیلے ابن مسعود کا بیان ان کی نظر میں متواتر کا درجہ رکھتا ہے۔ افسوس!
پادری صاحب! اگر قرآن مجید متواتر کا درجہ رکھتا ہے۔ تو سورہ فاتحہ کا
متواتر ہونا اس سے بھی بڑھکر ہے۔ سارا قرآن تو صحابہ کو حفظ نہ تھا۔ مگر
سورہ فاتحہ تو ہر زن و مرد۔ بچے اور بوڑھے کے ورد زبان تھی۔ علامہ نووی
کہتے ہیں:۔ "اجمع المسلمون علی ان المعوذتین والفاتحۃ من القرآن"
یعنی مسلمانوں کا اجماع ہے۔ کہ معوذتین اور سورہ فاتحہ قرآن پاک کا جزو ہیں"
(اتقان جلد ۱ ص ۷۹)

پس اگر بالفرض ابن مسعود سورۂ فاتحہ کے جزو قرآن ہونے سے انکاری
بھی ہوں۔ تب بھی سورہ فاتحہ کے متواتر ہونے میں کوئی نقص نہیں۔
آپ نے شیعوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ان کا قول بھی پڑھ لیجئے:۔
"ہم شیخ صدوق و امثالہ کے مذہب پر ہیں۔ جو قرآن میں
کمی اور زیادتی کے قائل نہیں اور جن روایات سے کمی کا شبہ
ہوتا ہے۔ وہ اخبار احاد سے ہیں یا الفاظ تفسیری پر مشتمل ہیں"
(اخبار شیعہ۔ لاہور ۸۔ جولائی ۱۹۳۰ء)

پھر آپ نے کہا ہے کہ علماء اصول نے کسی آیت یا سورۃ کو جزو قرآن
ثابت کرنے کے لئے اس کا متواتر ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ اب غور فرماویں
کہ اس قاعدہ کے ہوتے ہوئے جب تمام اصولیوں نے، اہل سنت اور
شیعہ اصولیوں نے سورہ فاتحہ اور معوذتین کو جزو قرآن قرار دیا ہے۔ تو
کیا یہ اس امر کا زبردست ثبوت نہیں کہ آپ کا زعم باطل ہے اور سورہ فاتحہ

یقیناً متواتر النقل ہے۔

ابن مسعودؓ نے معوذتین اور فاتحہ کو کیوں خارج قرار دیا؟

آپ نے اس سوال کے جواب کے لئے عالم اسلامی کو تحدی کی ہے اس لئے ہم تفصیلاً اسکا جواب درج کرتے ہیں

پہلا جواب۔ (۱) علامہ رازی ابن مسعود کے سورہ فاتحہ اور معوذتین کو حذف کرنے کی روایت کو ضعیف اور ناقابلِ استناد قرار دیتے ہیں۔ اور اس روائت کو درائت کے خلاف بتلاتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں :۔

"والاغلب علی الظن ان نقل ھذا المذھب عن ابن مسعود نقل کاذب باطل" اغلب خیال یہی ہے کہ ابن مسعود کی طرف سے اس مذہب کا نقل کرنا کذب اور باطل ہے" (کبیر جلد ۱ صـ۲۱۳)

(۲) امام نووی کہتے ہیں :۔

"ومانقل عن ابن مسعود لیس بصحیح"، ابن مسعود سے جو نقل کیا گیا ہے۔ درست نہیں ہے (اتقان جلد ۱ صـ۷۹)

(۳) امام ابن حزم کتاب القدح المعلی میں لکھتے ہیں :۔

"ھذا کذب علی ابن مسعود وموضوع وانما صح عنہ قراءۃ عاصم عن زرعنہ وفیھا المعوذتان والفاتحۃ"

کہ یہ ابن مسعود پر افتراء ہے روائت موضوع ہے۔ ابن مسعود کی صحیح قرارت وہ ہے۔ جو عاصم کی قرارت ہے۔ اور اس میں سورہ فاتحہ اور معوذتان موجود ہیں۔ (اتقان جلد ۱ صـ۷۹)

ان ہر سہ بیانات کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ ابن مسعود کی حذف الفاتحہ والی روائت درست نہیں۔ بلکہ اس کے خلاف روائت موجود ہے۔ کہ ابن مسعود

کی قرأت میں فاتحہ اور معوذتان موجود نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ علامہ ابن حجر نے ابن مسعود کی سورہ فاتحہ کے حذف والی روایت کی تصحیح کی ہے۔ مگر ان کا نقطۂ نظر صرف راویوں کے حالات پر ہے۔ ازروئے درائت اس روایت کی وہی حیثیت ہے۔ جو ائمہ ثلاثہ نے ذکر کی ہے۔

قاضی ابوبکر الباقلانی اپنی کتاب "اعجاز القرآن" میں لکھتے ہیں:۔

"وقد یجوز ان یکون نسخہ عن مصحفہ لا لانہ نفاہ من القرآن بل عول علی حفظ الکل ایاہ علی ان الذی یرووونہ خبر واحد لا یسکن الیہ فی مثل ھذا ولا یعمل علیہ ۔ ۔ ۔ ۔ ولوکان قد انکر السورتین علی ما ادعوا لکانت الصحابۃ تناظرہ علی ذالک وکان یظھر وینتشر الخ"

یعنی ہوسکتا ہے۔ کہ اس کا لکھنا ابن مسعود کے مصحف سے رہ گیا ہو۔ مگر نہ اس لئے کہ وہ اس کے قرآن میں سے ہونے کی نفی کرتا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ انہوں نے اس کو ہر ایک کے زبانی یاد کرنے پر بھروسہ کیا ہو۔ علاوہ ازیں روائت خبر واحد ہے۔ جس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ نہ اسے معمول بہ بنایا جاسکتا ہے۔ اگر ابن مسعود نے دو سورتوں کا انکار کیا ہوتا۔ جیسا کہ یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں۔ تو یقیناً صحابہ کرام ان سے اس بات پر مباحثات کرتے اور یہ امر شائع و ذائع ہوتا"

(زیر حاشیہ اتقان جلد ۲ ص ۱۹۳ و ۱۹۴)

گویا آپ بھی اس روایت کو درست تسلیم نہیں کرتے

دوسرا جواب۔ اگر اس روایت کو صحیح مانا جاوے۔ تب یہ جواب ہے کہ ابن مسعود نے اس خیال سے رجوع کر لیا تھا۔ علامہ رازی تو اس جواب کی بنیاد

حُسن ظن برر کھتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"قد نقل عن ابن مسعود حذف المعوذتين وحذف الفاتحة عن القرآن ویجب علینا احسان الظن به وان نقول انه رجع عن هذه المذاهب" (جلد ۱ صفحہ ۱۱)

لیکن میں اس جواب کو ابن سیرین کی اس روایت پر مبنی قرار دیتا ہوں جسے امام سیوطی نے یوں درج کیا ہے:-

"عن ابن سیرین قال کتب ابی بن کعب فی مصحفه فاتحة الکتاب والمعوذتین واللھم انا نستعینك واللھم ایاك نعبد وترکھن ابن مسعود وکتب عثمان منھن فاتحة الکتاب والمعوذتین" (اتقان جلد ۱ صفحہ ۶۵)

یعنی ابن سیرین کہتے ہیں۔ کہ ابی بن کعب نے اپنے مصحف میں سورہ فاتحہ۔ معوذتین۔ دعا اللھم انا نستعینك اور دعا اللھم ایاك نعبد درج کی تھیں۔ ابن مسعود نے ان سب کو ترک کر دیا۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے سورہ فاتحہ اور معوذتین درج کی ہیں"

اس روائت سے ظاہر ہے۔ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور ابن مسعود کے طریق عمل کی تردید کی اور صرف سورہ فاتحہ اور معوذتان کے لکھنے پر اکتفا کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ فعل نہ صرف حضرت ابن مسعود کے رجوع پر دلالت کرتا ہے۔ بلکہ صحابہ کے اجماع پر بھی دلالت کر رہا ہے۔ بخاری شریف میں لکھا ہے۔ کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا کے ہاں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ والے نسخے منگوا کر زید بن ثابت۔ عبد اللہ بن زبیر۔ سعید بن العاص اور عبد الرحمن بن الحارث رضی اللہ عنہم کے ذریعہ نقول

کروا کر اقطارِ عالم میں بھیجیں۔ اور اگر کسی نسخہ میں اس متفق علیہ نسخہ کی بجائے کاتب کی ذاتی رائے کی بنا پر کمی یا زیادتی تھی۔ تو ان سب کو جلانے کا حکم دیا لکھا ہے:۔

" وامر بما سواہ من القرآن فی کل صحیفة او مصحف ان یحرق "۔

(بخاری کتاب فضائل القرآن)

اگر ابن مسعودؓ نے اپنی رائے سے رجوع نہ کیا تھا۔ تو کیا اس واقعہ کے بعد ان کا پروٹسٹ یا کوئی بیان پیش کیا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ لہذا ہمارا یہ جواب بالکل درست ہے نہ صرف حسن ظنی کی بنا پر بلکہ واقعات کی رو سے بھی۔

تیسرا جواب۔ ابن مسعود کے مصحف میں سورہ فاتحہ اور معوذتین موجود نہ ہونے کی جو روایت بیان کی جاتی ہے۔ وہ ابن مسعود کا اپنا قول نہیں۔ اس لئے روائت کو درست فرض کرنے کی صورت میں بھی یہ سوال باقی ہے۔ کہ ابن مسعود نے کیوں ایسا کیا؟ اس سوال کا ایک جواب حضرت ابن مسعود کی زبانی جو مذکور ہے۔ وہ طبرانی اور البزار کی روایت میں یوں ہے:۔

(الف) " ویقول انما امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یتعوذ بھما وکان عبد اللہ لا یقرأ بھما اسانیدھا صحیحة "۔ (اتقان جلد ۱ ص ۷۹)

ابن مسعود کہتے تھے۔ کہ آنحضرت صلعم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا تھا کہ معوذتین کے ذریعہ استعاذہ (پناہ الٰہی مانگنا) کیا کریں لہذا ابن مسعود نماز میں بھی معوذتین نہ پڑھتے تھے۔

(ب) پھر اعمش نے ابراہیم سے روایت کی ہے:۔

" قیل لابن مسعود لم لم تکتب الفاتحة فی مصحفک فقال لو کتبتھا لکتبتھا فی اول کل سورة قال ابوبکر بن ابی داؤد یعنی حیث یقرء فی الصلوٰة قال واکتفیت بحفظ المسلمین

لها عن کتابتها" (تفسیر ابن کثیر سورۃ الفاتحہ)

یعنی ابن مسعود سے کہا گیا۔ کہ آپ نے اپنے مصحف میں سورہ فاتحہ کیوں نہیں لکھی۔ جواب دیا کہ اگر میں اس کو لکھتا تو سورہ کے ابتداء میں لکھتا۔ میں نے مسلمانوں کے اسے ازبر کرنے کے پیش نظر اسے لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ابوبکر کہتے ہیں۔ کہ انکی مراد ہر سورۃ کے ابتداء میں لکھنے سے یہ تھی کہ چونکہ سورہ فاتحہ کے بعد قرآن مجید کی ہر سورت قرات میں پڑھی جا سکتی ہے۔ اس لئے پھر سورہ فاتحہ ہر سورۃ کے اول لکھنی ضروری تھی۔

ان دونوں روایات سے ظاہر ہے۔ کہ ابن مسعود کو سورہ فاتحہ کے جزو قرآن ہونے کا انکار نہ تھا۔ بلکہ لکھنے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ اور معوذتین کو اگرچہ اللہ تعالےٰ کا کلام سمجھتے تھے۔ مگر قرآن کا جزو قرار نہ دیتے تھے۔ ہمارے نزدیک اول الذکر خیال اگرچہ سورہ فاتحہ کی شان کو بلند کرنے والا ہے۔ تاہم ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اجتہادی غلطی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پادری پال صاحب اس قیاس کو حجت پکڑ رہے ہیں۔ کہ سورہ فاتحہ بائبل سے ماخوذ ہے۔ ثانی الذکر رائے غلط فہمی پر مبنی ہے۔ معوذتین کے جزو قرآن ہونے پر صحابہ کے اجماع ہونے کے علاوہ آنحضرت صلعم کی صریح احادیث موجود ہیں۔ ایک روایت درج ذیل ہے:۔

"عن عقبۃ بن عامر قال رسول اللہ صلعم الا اعلمک سورتین من خیر سورتین قرء بہما الناس قلت بلیٰ یا رسول اللہ فاقرءنی قل اعوذ برب الفلق۔ قل اعوذ برب الناس"

یعنی عقبہ بن عامر کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کیا میں تجھے دو بہترین سورتیں نہ سکھاؤں جو لوگوں نے پڑھی ہیں۔ میں نے کہا ہاں یا رسول اللہ۔ پھر آپ نے

مجھے قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس سکھائیں"۔ (تفسیر ابن کثیر)

علامہ سیوطی لکھتے ہیں:۔

"قال البزار لم یتابع ابن مسعود علی ذالک احد من الصحابۃ وقد صح انہ صلی اللہ علیہ وسلم قرأھما فی الصلاۃ"۔ (اتقان جلد ۱ صفحہ ۷۹)

کہ البزار نے معوذتین کے متعلق روایت درج کر کے کہا ہے۔ کہ ابن مسعودؓ کے اس خیال کی تائید کسی ایک بھی صحابی نے نہیں کی۔ اور یہ امر قطعی طور پر ثابت ہے۔ کہ آنحضرت صلعم معوذتین کی نماز میں قرأت کیا کرتے تھے۔

ان بیانات کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ ابن مسعودؓ نے ہرگز یہ خیال نہیں کیا۔ کہ سورہ فاتحہ قرآن میں سے نہیں اور نہ ایسا کہا ہے۔ ہاں معوذتین کے متعلق بعض روایات میں ان کا انکار مروی ہے۔ مگر ان کا یہ خیال درست نہیں بلکہ ذاتی خیال ہے۔ جو محض ظن پر مبنی ہے۔ چنانچہ امام ابن قتیبہؒ نے مشکل القرآن میں تحریر کیا ہے:۔

"ظن ابن مسعود ان المعوذتین لیستا من القرآن لانہ رأی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعوذ بھما الحسن والحسین فاقام علی ظنہ ولا نقول انہ اصاب فی ذالک واخطأ المھاجرون والانصار قال واما اسقاطہ الفاتحۃ من مصحفہ فلیس لظنہ انھا لیست من القرآن معاذ اللہ ولکنہ ذھب الی ان القرآن انما کتب وجمع بین اللوحین مخافۃ الشک والنسیان والزیادۃ والنقصان ورأی ان ذالک مامون فی سورۃ الحمد لقصرھا ووجوب تعلمھا علی کل احد"۔ (اتقان جلد ۱ صفحہ ۸۰)

کہ ابن مسعود نے گمان کیا۔ کہ معوذتین قرآن میں سے نہیں۔ کیونکہ انہوں نے دیکھا۔ کہ آنحضرت صلعم حسنؓ اور حسینؓ کے لئے معوذتین کے ذریعہ استعاذہ کرتے ہیں۔ پس وہ اپنے ظن پر قائم ہو گئے اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ ان کا گمان ٹھیک تھا۔ اور تمام مہاجر و انصار غلطی پر تھے۔ ہاں ان کا سورۂ فاتحہ کو اپنے مصحف سے خارج کرنا اس خیال کی بنا پر نہ تھا۔ کہ یہ جزو قرآن نہیں معاذاللہ بلکہ ان کا اعتقاد تھا۔ کہ قرآن مجید محض اس لئے لکھا اور دو لوحوں کے درمیان جمع کیا گیا ہے۔ کہ بھول چوک۔ کمی وبیشی اور شک کا اندیشہ تھا۔ اور سورہ فاتحہ اپنے چھوٹا ہونے اور ہر مسلم پر اس کے سیکھنے کے وجوب کی وجہ سے اس پہلو سے محفوظ و مصئون ہے۔ لہٰذا انھوں نے اس اعتبار سے اسے درج قرآن نہ کیا۔

ناظرین کرام! ہر سہ جوابات نہایت واضح اور بیّن ہیں۔ اوّل تو روایت ہی بلحاظ درائت مخدوش ہے۔ اگر اسے درست تسلیم کرلیں۔ تو ابن مسعود کا اس سے رجوع ثابت ہے۔ پھر جو تصریح خود ابن مسعود سے مروی ہے اس کے رُو سے ان کے قول کے مطابق سورہ فاتحہ تمام دیگر سورتوں سے زیادہ متواتر اور ثابت ہے۔ پس پادری پال صاحب کا اعتراض ہر پہلو سے باطل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ماخذ؟

اس ضمن میں پادری صاحب لکھتے ہیں:۔

"حقیقت یہ ہے کہ بسم اللہ الخ نہ تو ابتدائے نبوت کا الہام ہے اور نہ وسط نبوت کا اور نہ ہی اختتام نبوت کا۔ بلکہ یہ آنحضرت کے ذہنی ارتقار کا نتیجہ ہے۔ جس کو فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں بعبارت بالا بیان کیا ہے۔" (سلطان التفاسیر صـ۱۲)

اس اقتباس کو پڑھنے والا سمجھیگا۔ کہ امام رازی جیسا مفسر اور محقق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے الہامی ہونے سے انکاری ہے اور اسے آنحضرت صلعم کا ذہنی ارتقاء قرار دے رہا ہے مگر یہ ایک مغالطہ بلکہ کذب بیانی ہے۔ نہ امام رازی کا یہ مذہب ہے نہ انہوں نے ایسا بیان کیا ہے انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے جزو قرآن ہونے کے جو سترہ ثبوت پیش کئے ہیں اور مختلف روایات کو درج کیا ہے۔ انہی میں سولھویں نمبر پر بلفظ "رُدِیَ" کیساتھ ایک مجہول روایت ذکر کی ہے۔ جس کا مفاد یہ ہے۔ کہ اوّل اوّل آنحضرت قریش کی رسم کے مطابق باسمك اللّٰھم لکھا کرتے تھے۔ آخر سورۃ النمل میں سلیمان کے قول بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنے لگ گئے۔ حالانکہ اوّل تو یہ روایت ہی مجہول ہے۔ اس سے استناد کرنا جائز نہیں۔ دوم یہ روایت کہتی ہے۔ "انه صلی اللہ علیہ وسلم کان یکتب" کیا آنحضرت صلعم فی الواقع لکھا کرتے تھے؟ اگر نہیں تو یہ روایت قابل اعتبار نہیں۔ سوم۔ اگر روایت درست بھی ہو۔ تب بھی یہ ثابت ہوگا۔ کہ اول آنحضرت مکاتیب و خطوط وغیرہ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا عام استعمال نہ فرماتے تھے۔ جب اللہ تعالےٰ نے سلیمانؑ کے خط کا ذکر فرمایا۔ تو آپ نے خطوط میں بھی وہی طریق اختیار کر لیا۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوا۔ کہ بسم اللہ الہامی نہیں۔ آنحضرت کا ذہنی ارتقاء ہے اگر ارتقاء ہی تھا۔ تو اُسے سلیمانؑ کی طرف منسوب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ تو ہم نے مجہول روایت کے لحاظ سے لکھا ہے۔ اب آیئے امام رازی کا مذہب بھی ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں :۔

" والذی عندی فیه ان النقل المتواتر ثابت بان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کلام انزله اللہ علی محمد صلی اللہ علیه وسلم وبانه مثبت فی المصحف بخط القرآن " (تفسیر کبیر جلد اصفحہ)

یعنی جو بات میرے نزدیک محکم ہے وہ یہ ہے کہ نقل متواتر سے ثابت ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ جو اس نے آنحضرت صلعم پر نازل کیا اور یہ کہ وہ مصحف میں قرآنی خط میں ثابت ہے۔

پس پادری صاحب کی بنیاد غلط اور انکا پیشکردہ گواہ انکو جھٹلا رہا ہے۔

علماء کا اختلاف

بسم اللہ الرحمن الرحیم کے متعلق علماء و مفسرین میں اختلاف ہوا ہے۔ کہ کیا یہ قرآن مجید کی ہر ایک سورۃ میں مستقل آیت ہے یا نہیں؟ پھر کیا یہ سورہ فاتحہ میں علیحدہ آیت ہے یا الحمد للہ رب العالمین کے ساتھ مل کر؟ جیسا کہ قاعدہ ہے اجتہادی رنگ میں عقول بشریہ مختلف ہیں۔ اس لئے علماء دونوں طرف گئے ہیں۔ بعض نے اسے ہر سورت میں آیت شمار نہیں کیا۔ اور دوسروں نے اسے ہر جگہ مستقل آیت قرار دیا ہے۔ لیکن اس امر میں کسی کا اختلاف نہیں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم خدا کا کلام ہے۔ آنحضرت صلعم کا ذہنی ارتقاء نہیں۔ پس جو اختلاف ہے۔ وہ بھی پادری صاحب کی تائید نہیں بلکہ تردید کر رہا ہے۔ چنانچہ مصنف روح المعانی امام رازی کے جواب میں لکھتے ہیں:-

"لیس فیهما سوی اثبات انها آیة وهو مسلم لکن من القرآن اما انها من الفاتحة فلا" (جلد ۱ صفحہ ۳۹)

کہ ان روایات سے ثابت ہوا۔ کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم آیت قرآنی ہے۔ اور یہ مسلم ہے۔ اس میں اختلاف نہیں۔ لیکن یہ کہ سورہ فاتحہ کی آیت مستقلہ ہے یہ ہمیں مسلم نہیں۔ پس ائمہ کا اختلاف اس بات میں نہیں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم الہامی کلام ہے یا ذہنی ارتقاء۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم کے متعلق روایات

اس باب میں اس قدر روایات

وارد ہوئی ہیں۔ کہ ان کے لئے علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے امام فخر الدین رازی نے بعض روایات تفسیر کبیر جلد اول میں درج کی ہیں، موقعہ کے لحاظ سے ہم دو احادیث ذیل میں لکھتے ہیں :-

(۱) عن ام سلمة انها قالت قرأ رسول الله صلی الله علیه وسلم فاتحة الکتاب فعدّ بسم الله الرحمن الرحیم اٰیة الحمد لله رب العالمین اٰیة - الحدیث (جلد ا صنا)

(۲) عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال فاتحة الکتاب سبع اٰیات اولاهن بسم الله الرحمن الرحیم (۔۔)

دونوں احادیث میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو سورۃ فاتحہ کی آیت اور قرآن مجید کی جزء قرار دیا ہے۔

اب ہم بعض ائمہ کے اقوال بھی مختصراً ذکر کرتے ہیں :-

(۱) عکرمہ اور الحسن کا قول ہے۔ "اول ما نزل من القراٰن بسم الله الرحمن الرحیم واول سورة اقراء باسم ربك"۔ کہ پہلی آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہوئی اور پہلی سورۃ سورہ اقراء باسم ربک ہے۔

(۲) ابن عباس کا قول ہے :- "اول ما نزل جبریل علی النبی صلی الله علیه وسلم قال یا محمد استعذ ثم قل بسم الله الرحمن الرحیم"۔

(۳) امام سیوطی کہتے ہیں :- "هی اول اٰیة نزلت علی الاطلاق"۔ کہ بسم اللہ مطلق طور پر پہلی آیت ہے جو نازل ہوئی۔ (تینوں عبارتوں کیلئے۔ اتقان جلد ا صلا)

(۴) یعلی کی روایت ہے :- کہ محمد بن الحسن نے بسم اللہ کو قرآن کی جزء قرار دیا (کبیر جلد ا صنا)

(۵) امام ابو حنیفہ کا قول ہے یقرأ بسم الله الرحمن الرحیم ویسرّ بها۔ کہ بسم اللہ کو قراءت میں مخفی پڑھا جاوے۔" (کبیر جلد ا صنا)

(۶) امام شافعی کہتے ہیں:- بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم آیۃ من اول سورۃ الفاتحۃ وتجب قراءتہا مع الفاتحۃ" کہ بسم اللّٰہ سورہ فاتحہ کی آیت ہے اور سورہ فاتحہ کے ساتھ اسکی قرارت واجب ہے۔ (کبیر جلد ۱ صـ۱۰۱)

(۷) یروی عن احمد بن حنبل انہ قال التسمیۃ آیۃ من الفاتحۃ الا انہ لیسر بہا فی کل رکعۃ" امام احمد بن حنبل کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا بسم اللّٰہ سورہ فاتحہ کی آیت ہے۔ مگر اسے ہر رکعت میں آہستہ پڑھا جاوے۔ (کبیر جلد ۱ صـ۱۰۵)

فارسی اور یہودی اور بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

پادری صاحب لکھتے ہیں کہ "بعض مسیحی مصنفین کا خیال ہے۔ کہ بسملہ فارسیوں کے ایک مقولہ کا ترجمہ ہے۔ لیکن فرماتے ہیں:-

"مجھے بے حد افسوس ہے۔ کہ میں ان مصنفین کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتا"

اور عدم اتفاق کی وجہ یوں بیان کرتے ہیں:-

"جس مذہب میں تناسخ کی تعلیم ہو وہ ہرگز ہرگز خدا کو بخشایندہ وبخشائش گر نہیں کہہ سکتا" (صـ۱۳ م)

اگر یہ دلیل درست ہے۔ تو میں کہتا ہوں۔ کہ جس مذہب میں "کفارہ" کی تعلیم ہو۔ کہ خدا نے انسانوں کے گناہوں کو بغیر بدلہ معاف نہ کیا۔ بلکہ بیٹے کو ذبح کر دیا۔ وہ مذہب خدا کو بخشایندہ و رحمان نہیں کہہ سکتا۔ لہذا بسملہ کا ماخذ عیسائیوں کی بائبل بھی نہیں ہو سکتی۔ بھلا جو بے گناہ لخت جگر کو ذبح کرتا ہے۔ اس سے غیر کو کیا امید ہو گی؟

اس وقت بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم کے متعلق "مسیحی مصنفین" کے دو قول

ہمارے سامنے ہیں۔ بعض لوگ اسے زرتشتیوں سے اخذ شدہ قرار دیتے ہیں اور پادری پال اسے "کتب مقدسہ سے اقتباس" بتلاتے ہیں۔ دونوں قول بے دلیل اور توہمات پر مبنی ہیں۔ اس لئے دونوں ساقط ہیں۔
اذا تعارضا تساقطا۔ سچ یہی ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔ جو براہ راست محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

پادری پال کی ایک اور خیانت

پادری صاحب نے لکھا ہے:۔
"امام فخرالدین رازی نے لفظ اللہ کے اشتقاق پر بحث کرتے ہوئے ایک عبرانی یا سریانی جملہ نقل کیا ہے۔ جس کے متعلق بعض مسلمان عالموں کا خیال ہے کہ بسم اللہ الخ اسی کا ترجمہ ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں کہ قال بعضهم هذه اللفظة ليست عربية بل عبرانية او سريانية فانهم يقولون الها رحمانا ومرحيانا فلما عرب جعل الله الرحمن الرحيم۔ تفسیر کبیر جلد اول صفحہ ۸۴۔ اگر بسم اللہ الخ درحقیقت فارسیوں کی کتابوں سے ماخوذ ہوتا۔ تو مسلمان علماء کو اس کے ظاہر کرنے میں کوئی تامل نہ ہوتا جسطرح انہوں نے کھلے الفاظ میں اس کا اظہار کیا کہ یہ یہودیوں کی مقدس کتابوں سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی بیان کرسکتے تھے۔ کہ یہ فارسیوں کی کتاب سے ماخوذ ہے" (ص ۱۴۵)

ناظرین کرام! تفسیر کبیر کا حوالہ مذکور میرے سامنے ہے۔ امام رازی نے لفظ اللہ کے اشتقاق کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ذکر کیا ہے

کہ شاید یہ لفظ الہاً سے مشتق ہو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو کسی ایک مسلمان نے بھی فقرہ "الہا رحمانا رحمانا حیانا" کا ترجمہ قرار نہیں دیا۔ بلکہ اس حوالہ میں تو صرف "اللہ" کے لفظی اشتقاق کی بحث ہے۔ امام رازی نے اس قول کو مردود بتلاتے ہوئے لکھا ہے:۔ "ھٰذا بعید ولا یلزم من المشابھۃ الحاصلۃ بین اللغتین الطعن فی کون ھٰذہ اللفظۃ عربیۃ اصلیۃ" (جلد ا صفحہ ۸۴)

مگر پادری صاحب ہیں کہ پر کا کوا اور اتنی سی بات کا افسانہ بناتے ہیں۔ کہ گویا "مسلمان علماء نے کھلے الفاظ میں اس کا اظہار کیا کہ یہ یہودیوں کی مقدس کتابوں سے ماخوذ ہے"

ایک نہ معلوم فقرہ جسے پہلے عبرانی یا سریانی جملہ کہتے ہیں۔ اخیر "یہودیوں کی مقدس کتابوں" سے بدل جاتا ہے۔ لفظی اشتقاق کا خیال "مسلمان علماء کا کھلے لفظوں میں اظہار" بن جاتا ہے۔ اگر یہ خیانت نہیں۔ کہ اقتباس ناجائز طور پر نقل کیا جائے۔ مفہوم کو بدل دیا جائے۔ ذرہ کا پہاڑ بنا دیا جائے۔ تو بتلائیے کہ خیانت کس چیز کا نام ہے ؟

ایک قابل غور بات

پادری صاحب نے بسملہ کو یہودیوں کی کتب مقدسہ سے اقتباس بتلایا ہے جسکے معنی یہ ہیں۔ کہ آنحضرت صلعم نے توراۃ یا بائبل سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو اخذ کیا ہے۔ لیکن اس جگہ قابل غور بات یہ ہے۔ کہ کیا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو موجودہ ترکیب کی صورت میں بائبل سے لیا ہے یا انفرادی طور پر ؟ اگر کہو کہ بسملہ بہ ہیئت موجودہ بائبل میں موجود ہے۔ تو یہ سراسر باطل ہے کیونکہ یہ الفاظ کسی ایک جگہ بحالت مجموعی موجود نہیں۔ اور نہ ہی عیسائیوں کو ایسا دعویٰ ہے۔ اگر کہو۔ کہ یہ الفاظ بلحاظ اپنے مفہوم کے

متفرق مقامات پر موجود ہیں۔ اور آنحضرت صلعم نے ایک لفظ کہیں سے اور دوسرا کہیں سے لے کر یہ آیت بنالی۔ اور یہی وہ دعویٰ ہے جو عیسائیوں کی طرف سے کیا جارہا ہے۔ چنانچہ پادری پال صاحب نے زبور ۱۱۱/۴ کی نصف آیت "خداوند مہربان اور رحیم ہے" اور خروج ۳۴/۶ کو کتر و بیونت کر کے "موسیٰ نے ...... خداوند کا نام لے کر کہا ... خداوند خداوند خدا رحیم اور مہربان" کا فقرہ پیش کیا ہے۔ (ص ۱۹) اگر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بائبل سے ماخوذ ہونے کا یہ مطلب ہے۔ تو یہ بالکل بچوں کا سا خیال اور نہایت مضحکہ انگیز دعویٰ ہے۔ کیونکہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اپنے تمام اجزاء کے ساتھ عربی میں موجود تھی۔ باء۔ اسم۔ اللہ۔ الرحمٰن۔ الرحیم سب کلمات عرب جانتے تھے اور انفرادی طور پر یہ سب الفاظ ان میں مستعمل تھے اور آنحضرت صلعم عربی زبان میں ماہر تھے۔ اب بتلائیے۔ کہ پھر اسبات کی کیا ضرورت تھی۔ کہ ایک لفظ زبور سے اور دو لفظ خروج سے اور وہ بھی پادری صاحب کے عبرانی سے ترجمہ کے اخذ کئے جاتے۔ یہ دعویٰ یقیناً طفلانہ خیال ہے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ اگر پادری صاحب ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں گے تو انہیں بھی اس خیال پر پشیمانی ہوگی۔

عرب لوگ سینکڑوں ہزاروں سالوں سے ان کو استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ بلکہ جب تورات کا وجود بھی نہ تھا۔ عربی زبان موجود تھی۔ اور یہ الفاظ مستعمل ہوتے تھے۔ ان الفاظ کا صحیح مادہ عربی میں موجود ہے۔ پس یہ وہم بھی نہیں ہوسکتا۔ کہ عربوں نے یا آنحضرت صلعم نے یہ الفاظ بائبل سے لئے ہیں۔ بلکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔

حضرت سلیمانؑ اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پادری صاحب لکھتے ہیں:

"قرآن شریف خود اس کا مقر ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سلیمان کا قول ہے۔ اور آنحضرت صلعم بھی فرماتے ہیں۔ کہ صرف یہ دو شخصوں پر اُترا ہے۔ یعنے حضرت سلیمان پر اور خود آنحضرت پر" (صہ ۱۴)

"میں سطور بالا میں قرآن شریف کی ایک آیت سورۂ نمل میں سے نقل کر چکا ہوں۔ جس میں صاف طور پر بتایا گیا ہے۔ کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حضرت سلیمان علیہ السلام کا قول تھا" (صہ ۱۹)

ان عبارتوں سے پادری صاحب کا مقصد یہ ہے کہ ثابت کریں کہ آنحضرت صلعم نے بسملہ حضرت سلیمان کی کتاب سے لی ہے مگر نہ معلوم پادری صاحب اس قدر سادگی کیوں اختیار کر رہے ہیں۔ کیا وہ عیسائی اصحاب کو عقل و بینش سے اتنا کورا سمجھتے ہیں کہ وہ یہ بھی نہ پوچھیں گے کہ اچھا صاحب دکھاؤ۔ بائیبل میں کس جگہ سلیمان کا یہ قول موجود ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں۔ تو کیونکر کہہ سکتے ہو کہ بسملہ بائیبل سے ماخوذ ہے؟ سلیمان کا قول ہے۔ اگر کہو کہ قرآن مجید خود اقراری ہے۔ تو میں کہتا ہوں۔ کہ قرآن مجید تو تم آنحضرت صلعم کا اپنا اختراع قرار دیتے ہو خدا کا کلام مانتے نہیں۔ اس لئے تم اپنے عقیدے کے رُو سے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہو کہ آنحضرت صلعم نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بنا کر حضرت سلیمان کی طرف منسوب کر دی۔ اور ایسا کہنے سے تمہارا دعوے خود بخود ٹوٹ جاتا ہے۔ عیسائی صاحبان کے سامنے دو ہی راستے ہیں (۱) اگر وہ یہ کہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم فی الواقعہ حضرت سلیمان پر الہام ہُوا تھا۔ تو انہیں ماننا پڑے گا۔ کہ بائیبل محرف و مبدل ہے۔ ورنہ

بائبل سے حضرت سلیمانؑ کے اس الہام کا ثبوت دیں۔ (۲) اگر کہیں۔ کہ یہ آیت سلیمانؑ پر نہیں اُتری۔ قرآن مجید اور آنحضرت صلعم کا ارشاد (نعوذ باللہ) غلط ہے۔ تو پھر ان کا یہ دعویٰ ٹوٹ گیا۔ کہ آنحضرت صلعم نے یہ آیت بائبل کی حضرت سلیمانؑ کے قول سے اقتباس کی ہے۔ بہر حال جو بھی صورت اختیار کریں ان پر زد پڑتی ہے۔

بے شک یہ درست ہے۔ کہ قرآن مجید نے سلیمانؑ کے خط میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ آیت عربی زبان میں ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی زبان عربی نہ تھی۔ اس لئے ہرگز باور نہیں کیا جا سکتا کہ یہی الفاظ سلیمانؑ نے لکھے تھے۔ بلکہ درحقیقت قرآن مجید نے اس خط کے معنوں کو اپنے ایجاز اور بلاغت کے انداز میں ذکر فرمایا ہے۔ اسی لئے امام ابن جنی نے کہا ہے:۔

"ان جمیع ما ورد فی القرآن حکایۃ عن غیر اھل اللسان من القرون الخالیۃ انما ھو معرب عن معانیھم ولیس بحقیقۃ الفاظھم"

یعنی قرآن مجید میں جو گذشتہ زمانوں کے غیر عربوں سے حکایت ہے وہ صرف اُن کے معانی کو عربی میں تبدیل کیا گیا ہے۔ اور درحقیقت اُن کے الفاظ نہیں ہیں۔ (اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۲۵)

پس سلیمانؑ نے بسملہ کا مفہوم لکھا تھا۔ اور یہ مفہوم ان کو انکی زبان میں بذریعہ وحی بتایا گیا تھا۔ لہذا قرآن مجید اور احادیث کا بیان درست ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہے۔ کہ آنحضرت صلعم نے بسملہ کو بائبل سے اخذ نہیں کیا۔ انجیل کی رُو سے بھی روایت بالمعنی جائز ہے دیکھیے حضرت مسیح کہتے ہیں:

"وہ (دکھن کی ملکہ) دنیا کے کنارے سے سلیمان کی حکمت سننے کو آئی"۔ (متی ۱۲/۴۲) لیکن عہد قدیم میں یوں لکھا ہے:-

"جب سلیمان کا شہرہ سبا کی ملکہ تک پہنچا۔ تو وہ مشکل سوالوں سے اُسے آزمانے آئی"۔ (۲ تواریخ ۹/۱)

اگر روایت بلحاظ مفہوم درست نہ مانی جاوے۔ تو عہد قدیم اور عہد جدید کے بیان میں فرق ہے۔

اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جاوے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم انہی لفظوں میں سلیمان پر نازل ہوئی تھی۔ اور آنحضرتؐ پر بھی نازل ہو گئی۔ تب بھی کوئی ہرج نہیں۔ ایک وحی دو نبیوں پر نازل ہو سکتی ہے۔ موسیٰؑ اور ہارونؑ کے پاس ایک ہی کتاب توراۃ تھی۔ اس صورت میں بھی "اقتباس" کا اعتراض باطل ہے۔ بلکہ اس میں آنحضرت صلعم کا معجزہ ہے۔ کہ سلیمان کی جس وحی کو توراۃ و انجیل بیان نہ کر سکیں۔ قرآن پاک نے بیان کر دیا۔

بسملہ کے ماخذ پر توراۃ کی گواہی

ہم نے گذشتہ سطور میں پادری پال صاحب کی بسم اللہ کے ماخذ کے متعلق خام خیالیوں کا مکمل جواب لکھا ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ قرآن مجید، سورہ فاتحہ اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ماخذ دلائل کی روشنی میں بجز اللہ تعالےٰ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس جگہ بسم اللہ کی بحث کو مکمل کرنے کے لئے بتاتے ہیں۔ کہ توراۃ نے جہاں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی بیان کی ہے اسی جگہ یہ علامت بھی لکھی ہے۔ کہ وہ نبی خدا کا نام لے کر بات کہیگا۔ لکھا ہے:-

" اس سب کی مانند جو تو نے خداوند اپنے خدا سے حورب میں

مجمع کے دن مانگا۔ اور کہا کہ ایسا نہ ہو۔ کہ میں خداوند اپنے خدا کی آواز
پھر سُنوں۔ اور ایسی شدت کی آگ میں پھر دیکھوں تاکہ میں مر نہ جاؤں
اور خداوند نے مجھے کہا۔ کہ انہوں نے جو کچھ کہا سو اچھا کہا میں اُن
کے لئے ان کے بھائیوں میں سے **تجھ سا ایک نبی** برپا کرونگا
اور اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالونگا۔ اور جو کچھ میں اُسے فرماؤنگا۔
وہ سب اُن سے کہیگا۔ اور ایسا ہوگا۔ کہ **جو کوئی میری
باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا نہ
سُنے گا**۔ تو میں اس کا حساب لوں گا۔" (استثناء $\frac{18}{16-19}$)

یہ پیشگوئی قطعی اور حتمی طور پر آنحضرت صلعم پر چسپاں ہوتی ہے آنحضرت صلعم
کے سوا کسی نے مثیل موسیٰ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اور نہ کوئی واقعہ میں مثیل موسیٰ
تھا۔ یہود ایلیاہؑ۔ مسیحؑ اور وہ نبیؑ تین شخصوں کے منتظر تھے۔ (یوحنا $\frac{1}{20-21}$)
حواریوں نے بھی اس پیشگوئی کا مصداق مسیح کے علاوہ دوسرے نبی کو قرار
دیا ہے۔ جس کے منتظر تھے۔ (اعمال $\frac{3}{21، 22}$) چونکہ بنی اسرائیل نے آئندہ شریعت
کا کلام سُننے سے انکار کردیا۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے ان کے بھائیوں
بنو اسمٰعیل میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ اور آپ نے جو بھی
الٰہی کلام سنایا۔ اس کے پہلے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" موجود ہے گویا توراۃ کے الفاظ

"וְהָיָה הָאִישׁ אֲשֶׁר
לֹא-יִשְׁמַע אֶל-דְּבָרַי
אֲשֶׁר יְדַבֵּר בִּשְׁמִי
אָנֹכִי אֶדְרֹשׁ מֵעִמּוֹ"

میں پیشگوئی تھی۔ کہ موعود نبی اللہ تعالیٰ سے کلام پاکر اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی وحی کے بعد خدائی شریعت سنائے گا۔ چنانچہ یہ پیشگوئی پوری ہوگئی۔ اب وہ لوگ جو اس شریعت کو نہیں سنتے۔ اپنا فکر کرلیں۔ کیونکہ خدا تعالےٰ ان سے حساب لے گا۔ ان الینا ایابھم ثم ان علینا حسابھم۔

لفظ اللہ کا مادہ

لفظ اللہ کے مادہ کے متعلق محققین کے دو گروہ ہیں (۱) جو کہتے ہیں۔ "ان ھٰذا اللفظ اسم علم للہ تعالیٰ و انہ لیس بمشتق البتۃ" کہ اللہ ذات باری کا ذاتی نام ہے۔ اور ہرگز مشتق نہیں۔ یہ امام الخلیل۔ سیبویہ۔ اکثر الاصولیین والفقہاء اور امام فخر الدین رازی کا قول ہے۔ (۲) بعض ایسے لوگ ہیں جو لفظ اللہ کو مشتق مانتے ہیں۔ ان لوگوں نے اس کے اشتقاق پر دلچسپ بحثیں کی ہیں اور آٹھ طور پر اشتقاق ذکر کیا ہے۔ (دیکھو تفسیر کبیر جلد ۱ صـ ۸۱-۸۲)

پادری پال صاحب کو جو سوجھی تو بغیر دیکھے بھالے لکھ مارا کہ:-

"علماء اسلام کو لفظ اللہ کے مادہ کے ڈھونڈنے میں اس قدر پریشانی نہ ہوتی۔ اگر وہ اس کے مادہ کو عبرانی زبان یا بالتخصیص کتب مقدسہ بائبل میں تلاش کرتے۔ کیونکہ یہ لفظ درحقیقت عربی لفظ نہیں ہے۔ بلکہ عبرانی لفظ ہے اور کتب مقدسہ میں نہایت کثرت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ لفظ اللہ کا مادہ عبرانی میں الہ ہے۔ جس کے معنی عَبَدَ عبادت کے ہیں۔ لیکن یہ لفظ بحیثیت مادہ کتب مقدسہ میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ الیٰہ الوہ[1] جو لفظ اللہ کی اصل ہے۔ اس سے مشتق ہوا ہے۔ اور

[1] عبرانی کا الوہ درحقیقت عربی لفظ الٰہ سے ماخوذ ہے۔ ابو العطاء

کتب مقدسہ میں کثرت کے ساتھ استعمال ہوا ہے اور معبود حقیقی اور معبود غیر حقیقی دونوں پر اس کا اطلاق ہوا ہے۔" (صـ۲)

پادری صاحب کی سادگی پر حیرت ہو رہی ہے۔ کیا بھولے پن سے فرماتے ہیں۔ کہ لفظ اللّٰہ "درحقیقت عربی لفظ نہیں ہے بلکہ عبرانی لفظ ہے۔" دلیل یہ ہے۔ کہ عبرانی مادہ אלה کے معنی عَبَدَ آتے ہیں۔ جناب والا! تحقیق اللغات کا یہ طریق نہیں۔ اگر الہ کے معنی عَبَدَ آنے پر ہی لفظ اللّٰہ کے عربی یا عبرانی ہونے کا دارومدار ہے تو لیجئے عیسائیوں کی شرح کردہ قاموس عربی "المنجد" میں پڑھ لیجئے۔ "أَلَهَ۔ الوهة وإلاهة اے عَبَدَ عبادۃً" (صـ۱)

آپ خواہ مخواہ اشتقاقی بن رہے ہیں۔ صاحب المنجد بھی کہتا ہے:۔

"اللّٰہ اسم الذات الواجب الوجود"

اللّٰہ مشتق نہیں۔ بلکہ ذات واجب الوجود کا نام ہے۔" آپ الوہ کو اللّٰہ کی اصل بتلاتے ہیں۔ مگر اس کا استعمال معبود حقیقی و غیر حقیقی میں مانتے ہیں حالانکہ لفظ اللّٰہ صرف حقیقی معبود یعنی ایک ہی ذات پر بولا جاتا ہے۔ اشتقاق کے قاعدہ کو سوچ کر اپنی غلطی کا اقرار کیجئے۔

عربی اور عبرانی کا مقابلہ کرنا اس وقت کا موضوع نہیں اور یوں بھی پادری صاحب کے سامنے یہ بحث کرنا بہرہ کو سنانے والی بات ہے۔ مختصر یوں ہے کہ عربی اور عبرانی میں بلا مبالغہ بحرِ ذخار اور بند جوہڑ کی نسبت ہے۔ عربی کی افضلیت کا اعتبار نہ ہو۔ تو عیسائی مشنری علامہ انستاس الکرملی کی جو عربی کے بھی فاضل ہیں۔ شہادت پڑھ لیجئے۔ لکھتے ہیں:۔

"ان اللغة العربية بلغت من الرقی ومجاراۃ العلم والفن والصناعة مالم تبلغه ایة لغة کانت من

قدیمة وحدیثة .... ان فیها من المحاسن والبدائع ما لا یضاهیها فیها لغة من اللغات المعروفة علی وجه المعمور۔ ان لغة عدنان لغة حیة، بدیعة الوضع غنیة بما فیها من انواع الاشتقاق والوضع وهی تجاری اعظم اللغات معانی ومبانی ولا تحتاج الی غیرها کسائر اللغی لانها غنیة بکنوزها وقد فاقت جمیع سائر الالسنة بوضع الفاظ معنویة تصف حالات النفس وصعودها الی خالقها وهی صفة لم تتشاهد فی ای لغة کانت۔" (جریدہ "فلسطین"۔ یافا ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ ۸ اگست ۱۹۳۶ء)

اخبار بھی مسیحی ہے۔ گواہ بھی مسیحی پادری ہے۔ شہادت کا خلاصہ یہ ہے کہ عربی زبان دنیا بھر کی موجودہ اور پرانی زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ گویا ایک عبرانی کیا۔ سب زندہ اور مردہ زبانوں میں سے افضل ترین زبان عربی زبان ہے سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے عربی زبان کو ام الالسنہ ثابت فرمایا ہے۔ (منن الرحمان) غیر مسلم محقق بھی اس کے قریب پہنچ رہے ہیں۔

"التفات پر اعتراض کا جواب"

سورہ فاتحہ میں صفات الٰہیہ کے ذکر کے بعد ایاك نعبد وایاك نستعین میں اللہ تعالیٰ مخاطب ہے۔ جس میں ایک لطیف روحانی نکتہ ہے۔ کہ جب عابد کو الحمد للہ رب العالمین الرحمٰن الرحیم مالك یوم الدین کی پوری معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ ان صفات کا پورا پورا تصوّر کرتا ہے۔ تو وہ ذات باری کو غائب نہیں حاضر پاتا ہے۔ اور اب اس کا خطاب غائبانہ نہیں بلکہ مشافہانہ ہوتا ہے۔ اسی لئے مخاطب کے صیغے

آئے ہیں۔ پادری پال صاحب کو لطافت اور روحانیت سے کیا۔ انہیں تو اعتراض کرنے سے غرض ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :-

"میں اس امر کو تسلیم کرتا ہوں۔ کہ عرب کے بعض شاعروں کا یہ دستور تھا۔ کہ وہ اپنے اشعار میں کبھی کبھی حاضر کو غائب اور غائب کو حاضر سے خطاب کیا کرتے تھے۔ جس کو علمائے علم ادب کی اصطلاح میں التفات کہتے ہیں۔ لیکن یہ طریق خطاب خاص اشعار سے مخصوص تھا۔ وہ نثر میں کبھی اس طرز سے کام نہیں لیتے تھے۔ قرآن شریف چونکہ نثر میں ہے۔ اس لئے اس اسلوب کا اختیار کرنا اس کے لئے مناسب نہ تھا۔" (ص۲۴)

الجواب (۱) صنعت التفات تحسین معنی کا ذریعہ ہے۔ اس کا وزن شعر وغیرہ سے علاقہ نہیں اور جو صنعت معنی سے تعلق رکھتی ہو۔ اسے صرف اشعار سے مخصوص سمجھنا غلطی ہے۔ ضروریات شعریہ اور چیز ہیں۔ اور التفات اور چیز۔ ایک کا دوسرے پر قیاس نہیں ہو سکتا۔

(۲) ابھی تک ہماری نظر سے قدیم ادب عربی منثور میں التفات کی کوئی مثال نہیں گذری اشعار میں امثلہ بکثرت موجود ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ قدیم نثر زیادہ تر محفوظ نہیں۔ چنانچہ الاستاذ انیس المقدسی یسوعی نے لکھا ہے :-

"کان الادب العربی منحصراً فی الشعر علی الغالب"

کہ گذشتہ زمانہ میں ادب عربی عام طور پر شعر میں محدود تھا۔"

(الدول العربیۃ وادابہا ص۵۷)

لیکن ہم کہتے ہیں۔ کہ قرآن مجید پر اہل عرب کو یہ اعتراض نہیں سوجھا۔ بلکہ تمام فرسان البلاغۃ نے قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت کے سامنے سر جھکا دیے

اور آج بھی مسیحی کالجوں میں زبان دانی کے لئے قرآنی سورتیں داخل نصاب ہیں۔ پس قرآن مجید نے عربی ادب کے حصہ نثر میں ایک دلربا جدت پیدا کر دی۔ اگر کوئی ناواقف اسے "نامناسب" قرار دیوے تو یہ اس کے ذوق ادبی کا نقص ہے۔ اس میں قرآن پاک کا کیا قصور ہے۔

(۴۴) پادری صاحب کی تسلی کے لئے ہم التفاتِ ناقص کی ایک مثال بائبل سے پیش کرتے ہیں مگر ڈر ہے کہ کل کو پادری صاحب یہ نہ کہہ دیں کہ قرآن مجید نے صنعت التفات بھی بائبل سے اخذ کی ہے بہرحال وہ مثال یہ ہے۔ لکھا ہے :-

"فی ذالك الزمان جاء الیهم تتنای والی عبر النهر وشتر بوزنای ورفقاؤهما وقالوا لهم هكذا۔ من امركم ان تبنوا هذا البیت وتكملوا هذا السور۔ حینئذٍ اخبرنا هم علی هذا المنوال ما هی اسماء الرجال الذین یبنون هذا البناء (عزرا ۵ / ۳-۴)

"اس وقت نہر کے اس پار کا صوبہ دار تتنی اور شتر بوزنی اپنے مصاحبوں سمیت ان پاس آئے اور انہیں یوں کہا۔ کہ کس نے تم کو حکم کیا۔ کہ اس گھر کو بناؤ۔ اور اس دیوار کو اٹھاؤ۔ پھر ہم نے انہیں اس طور پر کہا کہ ان لوگوں کے کیا نام ہیں جو اس عمارت کی تعمیر کرتے ہیں" (عزرا ۵ / ۳-۴)

اس اقتباس میں غائب۔ حاضر اور متکلم کی ضمیریں ہیں۔ اگرچہ عربی ترجمہ اور اردو ترجمہ میں بائبل والوں نے فرق کر دیا ہے۔ مگر تاہم انہیں "تم" "ہم" اور "انہیں" کے الفاظ پر غور کرنے سے "التفات" صاف ظاہر ہے۔ وہو المراد

تکرار کا جواب

پادری صاحب سورۂ فاتحہ کے معنوی حصہ پر دوسرا اور رسالہ کے اعتراضات میں سے آخری اعتراض یوں لکھتے ہیں :-

"دوسرا اعتراض یہ ہے۔ کہ الرحمٰن و الرحیم کو دو متصل آیتوں میں دوبار ذکر کیا ہے۔ جو نہایت معیوب اور فضول تکرار ہے۔" عجب افسوس کہ بائبل میں ہزارہا "معیوب اور فضول تکراروں" کو ماننے والے محض ناقہمی سے لفظ الرحمٰن اور الرحیم کے دوبارہ آجانے پر چیں بجبیں ہوئے ہیں۔ پادری صاحب محل اعتراض کی حقیقت سمجھنے کے بغیر اعتراض کرنا صحیح نہیں۔ یاد رکھیں تکرار ایک نہایت ضروری چیز ہے۔ بلکہ کارخانۂ عالم کی ساری زینت ہی تکرار سے ہے۔ سمندر کے قطرات۔ بارش کی بوندوں۔ صحرا کے ذرّوں چمن کے پودوں۔ گلستان کے پھولوں میں ایک کے بعد دوسرا ہے۔ تکرار ہے مگر کیا ہی خوبصورت تکرار ہے۔ انسان کی ہستی بھی تکرار کی شرمندۂ احسان ہے تمام علوم تکرار کا نتیجہ ہیں۔ پس تکرار اپنی ذات میں بُری نہیں۔ ہاں معیوب تکرار وہ ہے۔ جو بے معنی اور بلا فائدہ ہو۔ جیسا کہ بائبل میں متعدد تکرار ہیں۔ مثال کے طور پر زبور ۵۳ اور ۱۴ کا مقابلہ کریں۔ باب کا باب ایک لفظ کے فرق کے بغیر من وعن مکرر ہے۔ سلاطین۔ تواریخ۔ گنتی اور خروج میں سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ چاروں اناجیل محض تکرار کا نتیجہ ہیں۔

آئیے اب ہم بتاتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ میں الرحمٰن الرحیم دوبار کیوں آیا ہے۔ بات یہ ہے کہ بسم اللہ میں اللہ۔ الرحمٰن اور الرحیم کا ذکر ہے پھر الحمد للہ رب العالمین میں بھی اللہ۔ الرحمٰن۔ الرحیم کا ذکر ہے۔ لیکن ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہو جائیگا۔ کہ اس جگہ تکرار نہیں۔ کیونکہ

پہلی آیت میں اللہ۔ الرحمٰن۔ الرحیم۔ اسم کی حیثیت سے ذکر ہوئے ہیں۔ اور دوسری آیت میں مسمّی کی حیثیت سے۔ چنانچہ پہلی آیت میں لفظ "اسم" اس حقیقت کو واشگاف کر رہا ہے گویا یوں کہا۔ کہ میں اللہ کے نام سے رحمٰن کے نام سے۔ رحیم کے نام سے شروع کرتا ہوں پھر کہا اللہ کی ذات کیلئے سب خوبیاں ہیں۔ رب العالمین کی ذات کیلئے سب محامد ہیں۔ رحمٰن کی ذات ہی حمد و ثنا کی حقدار ہے۔ رحیم کی ذات ہی ہر حسن و کمال کا سرچشمہ ہے مالک یوم الدین کی ذات ہی سب محاسن کی سزاوار ہے۔ یعنی پہلی آیت میں قائل کے مدنظر اسم اللہ۔ اسم الرحمٰن اور اسم الرحیم ہے اور دوسری آیت میں اسم کی بجائے مسمّی مخاطب ہے۔ اسی لئے اس منزل کے بعد ایاک نعبد کا نمبر آجاتا ہے۔ پس جو فرق اسم اور مسمّی میں ہوتا ہے جو لحاظ اور جو اعتبار نام اور نام والے میں ہوتا ہے وہی ان دونوں آیتوں کے الفاظ میں ہے۔ لولا الاعتبارات لبطلت الحکمۃ۔ اللہ کا نام بھی بابرکت اور پاک ہے اور اسکی ذات بھی۔ لہذا یہ تکرار نہ ہوا۔ پھر اسکو معیوب اور فضول لکھنا تو اپنی پردہ دری کرانا ہے۔

اب ہم پادری صاحب کے جملہ اعتراضات کا جواب لکھ چکے ہیں۔ اخیر پر پادری صاحب نے سورۃ فاتحہ کا مثلاً ایک لفظ الحمد للہ لے کر بائبل میں سے زبور۔ نحمیاہ اور تواریخ سے تین تین چار چار آیتیں نقل کر دی ہیں جس سے قرآن مجید اور سورۃ فاتحہ کا ایک عجیب کمال نظر آرہا ہے۔ پادری صاحب کا موازنہ محض ایک تصنع اور بناوٹ ہے۔ مگر تاہم ہم اس کا اصولی اور مفصل جواب لکھ چکے ہیں اور اگر بائبل کی بعض تعلیمات بہ پیرایہ احسن قرآن مجید میں موجود ہوں تو یہ نہ صرف قابل تعجب نہیں بلکہ ایسا ہونا ضروری ہے کیونکہ بائبل آخر ایک زمانہ میں خدا کا کلام تھی اور قرآن مجید نے دنیا بھر کی الہامی کتابوں کی کارآمد اور مفید تعلیمات مع زائد اضافہ پر حاوی ہونیکا دعویٰ کیا ہے فرمایا فیھا کتب قیمۃ لہذا یہ طریق بھی قرآن مجید کی خوبی ظاہر کر رہا ہے۔ وللہ الحمد۔ اب ہم اس باب کو ختم کرتے ہیں اور آئندہ باب میں مختصراً تفسیر سورۃ فاتحہ درج کرتے ہیں۔ وباللہ التوفیق۔

باب ششم

سورۂ فاتحہ کے معارف میں سے کچھ!

سورۂ فاتحہ حقائق و معارف کا بحر بیکراں ہے۔ اس بحرِ ذخار کا احاطہ انسانی طاقت سے باہر ہے۔ سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں:

"سورۂ فاتحہ میں اس قدر حقائق و دقائق و معارف جمع ہیں۔ کہ اگر ان سب کو لکھا جائے۔ تو وہ باتیں ایک دفتر میں بھی ختم نہیں ہو سکتیں"
(کشتی نوح صہ۵۲)

زمانہ گذرتا جائیگا دنیا کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ مگر سچ یہ ہے۔ کہ سورۂ فاتحہ کے معارف ختم نہ ہوں گے۔ اس متن کی سینکڑوں شرحیں ہو چکیں اور نہ معلوم کس قدر اور ہوں گی۔ ہزاروں غوطہ زن اس سمندر کے موتیوں کے لئے غوطہ زن ہوئے اور بے شمار لؤلؤ و مرجان لے کر نکلے۔ مگر آخر یہی کہتے رہے۔ جو حضرت مجدّد اعظم جری اللہ فی حلل الانبیاء نے فرمایا ؎

این چشمۂ رواں کہ بخلق خدا دہم
یک قطرۂ ز بحر کمال محمدؐ است

لوگ کہتے ہیں۔ ما لا یدرک کلہ لا یترک بعضہ۔ اس لئے میں اللہ تعالےٰ کے فضل و رحم کے ماتحت سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے بعض پہلو درج کرتا ہوں۔

موزونیتِ ترتیب

سورۂ فاتحہ کے الفاظ میں بینظیر ترتیب طبعی ہے اور یہ امر اس کے کلام خدا ہونے کا زبردست ثبوت ہے۔ سب سے پہلے ذاتِ خالق کا ذکر ہے۔ پھر اس کی صفات کا بیان ہے۔ پھر ان صفات کے ظہور کا ذکر ہے۔ لفظ اللہ میں ذات اور بعد ازاں چار صفات مذکور ہیں۔ اس کے بعد ان صفات کے اثرات و نتائج ذکر ہوئے ہیں۔ صفات کا ظہور مخلوق میں ہوا۔ اس لئے سب سے پہلے اشرف المخلوقات یعنی انسان کی پیدائش کی علت غائی بیان فرمائی۔ اور کہا۔ ایاك نعبد انسان کا مقام عابد کا مقام ہے اور خدا تعالیٰ معبود ہے اور اسی مقصد کے لئے چھوٹے و بڑے انسان پیدا ہوئے ہیں۔ فرمایا۔ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون (ذاریات ع۳) اس مقام عبودیت کا راستہ کیا ہے۔ کس طرح انسان اس کو حاصل کرے فرمایا۔ ایاك نستعین محض اللہ کی مدد سے۔ استعانت کی تفسیر میں فرمایا۔ واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ وانھا لکبیرۃ الا علی الخاشعین۔ (بقرہ ع۵) گویا اس آیت ایاك نعبد و ایاك نستعین میں مخلوق کا مقام۔ غرض و غایت۔ دائرۂ عمل اور اس کا ذریعہ بیان کر دیا۔ بالفاظ دیگر مخلوق کا ما علیہا و مالہا بتا دیا۔ اب انسان اس مقصد کے حصول کے لئے تگ و دو کریگا۔ علمی اور عملی جد وجہد کریگا۔ جس کی ابتداء اھدنا الصراط المستقیم سے ہوتی ہے۔ آخر پر انسانی زندگی کا نتیجہ بتا دیا۔ نیک اعمال کئے تو نتیجہ نعمت الٰہی ہے۔ بد اعمال کے مرتکب ہوئے۔ اصرار کرتے رہے تو نتیجہ لعنت ہے۔ جس کی دو شاخیں ہیں غضبِ الٰہی۔ ضلالت و گمراہی۔

یوں کہیئے کہ سورۂ فاتحہ نے خالق و مخلوق کے تعلق ان کے آغاز و انجام

اور اس کے محکم و شکستہ ہونیکو نہایت موزون ترتیب سے ذکر کیا ہے۔
اللہ تعالیٰ کی چار صفات ذکر کیں۔ جو اُمہات الصفات ہیں۔ گویا جملہ صفات الٰہیہ کسی نہ کسی پہلو سے ان چاروں کے ذیل میں آجاتی ہیں۔ پھر اُن کے دائرہ وسعت اور ظہور کے لحاظ سے ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے۔ پہلی صفت ربّ العالمین ہے۔ خدا کے ماسوا ہر چیز عالَم میں شامل ہے۔ اور اسے عالَم اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ عام طور پر خدا کی شناخت ہوتی ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں ؎

العاقلون بعالمین یرونہ + والعارفون رأوابہ اشیاء

تو لفظ العالمین ایک جامع لفظ ہے اور ربّ العالمین ہمہ گیر صفت ہے انسان۔ حیوان۔ نباتات۔ جمادات اور دیگر جملہ مخلوقات پر حاوی ہے۔ اور اس کی ربوبیت ہر ذرہ پر پرتو ڈال رہی ہے
دوسری صفت الرحمٰن ہے۔ اس کا ظہور ربوبیت کے بعد اور اس کا دائرہ ربوبیت سے کم ہے۔ کیونکہ رحمانیت کا جلوہ احساس کو چاہتا ہے گویا رحمت عامہ ہوگی۔ مگر ذوی الارواح والحواس تک۔ یعنی اس کا دائرہ انسان۔ حیوان اور نباتات تک محدود ہوگا۔
تیسری صفت الرحیم ہے۔ جو الرحمٰن کے بعد اور ایک محدود دائرہ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ کیونکہ رحیمیت کا مورد صرف وہ وجود ہونگے جو رحمانیت کی رحمت عامہ سے استفادہ کی کوشش کرتے ہیں وہ کوشش جسم کیلئے ہو یا روح کیلئے، دنیا کیلئے ہو یا دین کیلئے۔ بہرحال رحیمیت کا مورد بنتی ہے فرمایا۔ کُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَهٰۤؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۔
چوتھی صفت مالک یوم الدین ہے۔ اس کا تعلق کوششوں کے نتائج سے

ہے۔ اس لئے اس کا ظہور سب سے اخیر پر ہے۔ دنیا میں اس کی ایک جھلک ہے قیامت کو پورا ظہور ہوگا۔ اس لحاظ سے اس کا حق تھا۔ کہ سب سے اخیر پر رکھا جاتا۔ فرمایا۔ یوم لا تملك نفس لنفس شیئًا والامر یومئذ للّٰہ (الانفطار)

ترتیب کا ایک پہلو یہ ہے۔ کہ اس سورت میں پانچ امور اللہ تعالیٰ کے متعلق ذکر ہوئے ہیں۔ اور اس کے بالمقابل پانچ امور بطور نتیجہ انسان کے متعلق ذکر ہوئے ہیں۔ اور اس تقابل میں حیرت انگیز تناسب کو مدنظر رکھا گیا ہے (۱) اللہ تعالیٰ کے متعلق فرمایا۔ الحمد للّٰہ اس کے مقابل انسان کی طرف سے ایاك نعبد کہا گیا ہے۔ کیونکہ جب اللہ ہی سب محامد کا مالک ٹھہرا۔ اور سب خوبیاں اسی کے لئے ہوئیں وہی حسن و احسان کا منبع ہے۔ تو پھر انسان کسی دوسرے حسین یا محسن کی عبادت کیوں کرے وہ بلوری شیشہ کو کیوں پانی سمجھے اور سورج و چاند کا کیوں پرستار ہو۔ نہیں نہیں اُسے حقیقت شناس بن کر کہنا چاہیئے۔ ؎

چشمۂ خورشید میں موجیں تری مشہود ہیں + ہر ستارے میں تماشا ہے تری چمکار کا۔

اور اسے ایک ہی محبوب کا عاشق اور ایک ہی معبود کا عابد ہونا چاہیئے۔ ایاك نعبد گویا بندہ نے جب الحمد للّٰہ کو سمجھا تو اس کی روح آستانۂ احدیت پر ایاك نعبد کہتی ہوئی جھک گئی۔ الحمد للّٰہ سبب ہے اور ایاك نعبد اس کا نتیجہ و مسبب۔

(۲) رب العالمین کے مقابل ایاك نستعین رکھا جب اللہ ہی ذرہ ذرہ کا خالق ہے وہی کائنات کا مدبر ہے۔ اسی کی ربوبیت پر دنیا کا سلسلہ قائم ہے۔ تو بجز اس کے کون اس قابل ہے کہ انسان اُس سے امداد چاہے اور اعانت کا طالب ہو؟ بس رب العالمین کے تصور پر

مرکا فروں کے اعمال و مساعی سے بھی اس کا تعلق ہے۔ مگر اس کا حقیقی تعلق اور کامل ظہور مومنوں پر ہی ہوگا۔

ایاک نستعین کہنا فطرت کی آواز ہے۔ دونوں میں تلازم ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی صفت الرحمٰن کے مقابل یہ کہا اھدنا الصراط المستقیم کیونکہ کام کرنے کے لئے سب سامان مہیا کرنا صفت رحمانیت کا نتیجہ ہے۔ فرمایا۔ الرحمٰن علّم القرآن۔ مادی سامان بھی صفت رحمانیت کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں۔ اور روحانی سامان بھی۔ اسی لئے ضروری ہُوا۔ کہ جب صفت الرحمٰن کا تصور کیا جاوے۔ تو ایک مومن بے ساختہ پکار اُٹھے اھدنا الصراط المستقیم ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت فرمائیے۔ اس پر چلنے کے سامان پیدا فرمائیے۔ اور منزل مقصود تک پہنچائیے۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی صفت الرحیم کے لحاظ سے فرمایا صراط الذین انعمت علیہم۔ آپ رحیم ہیں۔ آپ نے طالبان حق کو اپنی نعمتوں اور اپنے انعامات سے متمتع فرمایا ہے۔ اور نبوت وبادشاہت وغیرہ انعام عطا فرمائے ہیں۔ ہم بھی اس صفت الرحیم کے ورد کرنیوالے ہیں۔ اس لئے عرض ہے۔ کہ ہمیں بھی ان لوگوں کے راستہ پر چلا کر انعامات سے بہرہ اندوز فرمائیے۔

(۵) مالک یوم الدین کے بالمقابل انسان کی طرف سے غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کی دعا ہوتی ہے۔ گویا بندہ یہ کہتا ہے کہ اے خدا تو مالک یوم الدین ہے۔ اور یہود کا دینی ودنیوی نعمتوں سے۔ نصاریٰ کا روحانی انعامات سے محروم ہو جانا ان کے اعمال کے نتیجہ ہیں اور تیری مالکیت کا ظہور ہے۔ انہوں نے تیری مالکیت سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اور راندۂ درگاہ بن گئے۔ میں دعا کرتا ہوں۔ کہ اے مالک خدا تو مجھے ان دھتکارے ہوئے لوگوں کے طریق سے بچا۔

الغرض سورۂ فاتحہ میں نہایت موزوں طور پر ایک ایک لفظ برمحل اور ترتیب طبعی کے مطابق رکھا گیا ہے۔ حتیٰ کہ ان میں ذرا سا تغیر و تبدل بھی نہیں ہو سکتا۔ الحمد للہ سے ولا الضالین تک اور بالعکس زبردست ترتیب موجود ہے۔ ایک کلمہ دوسرے کا ثبوت اور دوسرا پہلے کا نتیجہ اور مسبب ہے۔ یہ غیر معمولی اتصال کلمات اور سلسلۂ علت و معلول اس بات کا پختہ ثبوت ہے۔ کہ سورۂ فاتحہ انسانی کلام نہیں بلکہ خدائے علیم کا کلام ہے۔

فطرت انسانی کی مطابقت

اللہ تعالےٰ اور بندے کا تعلق مطاع اور مطیع کا ہے۔ بندہ کی ترقیات اور کامیابیوں کا راز اطاعت میں ہے حقیقی اطاعت عشق اور محبت سے پیدا ہوتی ہے۔ ہماری اطاعت سے اللہ تعالےٰ کا کوئی فائدہ نہیں۔ بلکہ ہمارا ہی نفع ہے اور ہمیں اطاعت آلہی کا اصل فائدہ تب ہی پہنچ سکتا ہے۔ جبکہ ہماری اطاعت عاشقانہ رنگ پر ہو۔ کیونکہ عاشق معشوق کے رنگ میں رنگین ہونے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ صبغۃ اللہ و من احسن من اللہ صبغۃ۔ اور اس وقت ارشادِ نبوی تخلقوا باخلاق اللہ صادق آتا ہے۔ غرض صحیح تابعداری محبت سے ہی ہو سکتی ہے۔

سورۂ فاتحہ نے اس باب میں بھی خاص تاثیر پیدا کی ہے۔ محبت یا حُسن سے پیدا ہوتی ہے یا احسان کا نتیجہ ہوتی ہے۔ فرمایا "الحمد للہ" سب حُسن ہر خوبی خدا میں موجود ہے۔ یعنی اے لوگو! اگر تم کسی کے حُسن کی وجہ سے اس کے محب و عاشق بنتے ہو۔ تو اللہ تعالےٰ کے حسن پر فریفتہ ہو۔ کیونکہ اس کا حُسن غیر محدود اور لازوال ہے ؎

دل مدہ الا بدلدارے کہ حُسنش دائم است + تا مرور دائمی یابی زخیر المحسنین

پھر فرمایا "رب العالمین" وہ جہانوں کا رب ہے۔ ذرہ ذرہ پر اس کا احسان ہے۔ تمہارے باپ دادوں کا بھی وہی خالق و محسن ہے۔ پس آؤ اگر حسن تم کو شیدائی نہیں بنا سکتا۔ اور تم محض احسان سے ہی کسی کے گرویدہ ہو سکتے ہو۔ تو احسان بھی اللہ تعالےٰ کا ہی ہے۔ کیونکہ وہ رب العالمین ہے۔

پھر فرمایا "الرحمٰن"۔ اس نے بغیر مانگنے اور بغیر عمل کے تم پر بیشمار احسان کئے ہیں۔ اس لئے احسانمندی کا تقاضا ہے۔ کہ تم اس کے محب بن جاؤ۔

پھر کہا کہ وہ "الرحیم" ہے۔ یعنی اس کے احسانات کا زمانہ باپ دادوں یا تمہاری ماضی تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ مستقبل میں بھی وہی احسان کرنے والا ہے۔ پس اگر آباؤ اجداد پر احسانات اور تمہاری اپنی ذات پر احسانات تمہارے جذبۂ محبت کو نہیں ابھار سکے۔ تو آئندہ کے احسانات کو ہی مدنظر رکھو۔

پھر اخیر پر صفت: مالك یوم الدین کو ذکر کیا۔ گویا گناہ گار سے کہا۔ کہ گھبرا نہیں۔ یہ نہ خیال کر۔ کہ گناہ معاف نہیں ہو سکتے۔ بلکہ یاد رکھ کہ وہ مالك ہے گناہ معاف کر سکتا ہے۔ نیکی کا زیادہ بدلہ دے سکتا ہے۔ پس اے گناہ گار انسان! اٹھ اور توبہ کے پانی سے گناہ کی آگ کو بجھا۔ شیطان آگ سے اور تو پانی سے پیدا ہوا ہے۔ پانی خواہ کتنا بھی گرم ہو۔ جب بھی آگ پر پڑیگا۔ اس کو خاکستر کر دیگا۔ لہذا مایوسی کا مقام نہیں۔

لفظ مالك یوم الدین میں سرکش اور گناہوں پر مصر انسان کیلئے

تہدید بھی ہے یعنی خدا کی صفات رحمت پر مغرور نہ ہو جانا۔ اگر تم نے اپنی
اصلاح نہ کی تو خدا سزا بھی دے گا۔ گویا ایسا شخص اگر محبت سے نہیں
تو خوف سے ہی اطاعت کا جوا اپنی گردن پر رکھ لے۔

ایک اور طرح سے یوں سمجھیں۔ کہ محبت کے تدریجی مدارج ہیں۔

(۱) انسان کے دل میں مخلوقات میں سے پہلے والدین کی محبت
پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ بچہ کے مربی ہوتے ہیں۔ رب ارحمھما
کما ربیانی صغیراً۔ سورہ فاتحہ میں اس ابتدائی محبت کے بالمقابل
رب العالمین فرمایا۔ کہ اے انسان! والدین نے تیری پرورش کی ہے
مگر وہ تیرے رب نہیں۔ تیرا رب تو اللہ ہے جو والدین کا بھی رب ہے۔ اس
لئے تیرا دل محض اسی کے لئے ہو۔ اور غیر کی محبت اس کی محبت پر غالب
نہ آئے۔ والذین امنوا اشد حباً للہ۔

(۲) قرابت و رشتہ داری کے دائرہ سے باہر سن شعور کو پہنچنے
کے بعد انسان اپنے معلم سے محبت کرتا ہے۔ کیونکہ سمجھتا ہے۔ کہ اس
نے میری دنیوی زندگی کو سدھار دیا ہے۔ اس مقام کے بالمقابل سورۃ
فاتحہ میں لفظ الرحمٰن آیا ہے۔ فرمایا الرحمٰن علّم القراٰن۔ گویا فرمایا
کہ اگر تم معلم سے محبت کرتے ہو تو الرحمٰن ہی حقیقی معلّم ہے۔ اس
سے محبت کرو۔

(۳) دنیوی علوم کے بعد عقلی بلوغت کو پہنچکر انسان نبی اور رسول
سے محبت کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کا روحانی معلم اور عاقبت کے متعلق
صحیح راہنمائی کرنے والا ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے مومنوں پر رحیم ہوتا ہے
فرمایا۔ بالمؤمنین رؤوف رحیم (توبہ ع ۱۶) اس کے مقابل اللہ تعالیٰ

نے اپنی وسیع صفت الرحیم کو پیش کر کے انسان کی چنگاری محبت کو مشتعل کیا ہے۔

(۴) دنیا میں تعلیم سے فراغت کے بعد انسان عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے۔ اور طبعاً ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے۔ جن کے اشارہ پر اس کی کوشش اور محنت کے نتائج کا انحصار ہوتا ہے۔ مگر اس جگہ ایک گونہ خوف بھی ہوتا ہے اس مقام کو ملائکہ کے مقام سے تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ والمد براءت اسماً۔ اس مقام کیلئے سورۂ فاتحہ میں مالك يوم الدين کا لفظ بیان فرمایا۔ اور کہا۔ کہ اس لحاظ سے بھی خدا ہی حقدار ہے۔ کہ تم اس سے محبت کرو۔ غرض ان صفات میں انسان کو محبت الٰہی کا پورا پورا درس دیا ہے۔ محبت اخذ و عطا کا نام ہے۔ رب العالمین اور الرحمٰن میں بندہ صرف مقامِ اخذ پر ہوتا ہے۔ الرحیم اور مالک یوم الدین میں مقام عطا پر۔ یعنی اپنی کوششوں کے ثمرات حاصل کرتا ہے۔ گویا اس طرح سے محبت کا دائرہ تکمیل پاتا ہے۔ اور انسان اللہ تعالےٰ کی صفات کے علم و معرفت کے بعد محبت الٰہی سے سرشار اور مے عشق سے مخمور ہو جاتا ہے۔ اور عاشقانہ انداز سے آگے بڑھتا ہوا پیشکش محبت پیش کرتا ہے۔ اور ایاك نعبد کا نعرہ بلند کرتا ہوا آستانۂ الوہیت پر جھک جاتا ہے۔ محبت اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہے۔ پھر دفور محبت اور جوش عشق میں اٹھتا اور محبوب کی طرف سے بھی حرکت چاہتا ہے اور بے ساختہ پکارتا ہے۔ وایاك نستعين ہم پر بھی نظر عنایت ہو۔ ہم غیر کے دروازے چھوڑ کر آپ سے ہی مدد کے طلبگار ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو جاتا ہے۔ گویا محبوب ازلی کی اس آواز کو سن رہا ہے کہ "او میرے بندے کیا چاہتا ہے کس مدد کا طالب ہے

جواب میں کہتا ہے اھدنا الصراط المستقیم آپ ہی میرے مطلوب ہیں میں غیر کو نہیں چاہتا۔ اپنا راستہ بتائیے۔ محبوب تک پہنچنا چاہتا ہوں اب فراق ناقابل برداشت ہے۔ آتش جدائی جھلس رہی ہے۔ اس لئے براہ کرم مستقیم راستہ بتائیے۔ جس پر چلنے سے جلدی وصال حاصل ہو جاوے ہاں ہاں صراط الذین انعمت علیھم "وہ راستہ بتائیے جس کے راہ رواں پہ آپ کرم گستری فرما چکے ہیں۔ نعمت وصال سے متمتع کر چکے ہیں۔ جب وہ وادی عشق میں سرگرداں تھے۔ تو جیسے اسوقت آپ نے ان کی رہنمائی کی تھی ویسے ہی اس جگہ بھی ہو۔ لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر۔ عاشق انہی تمناؤں اور آرزوؤں کے ساتھ میدان عشق کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ کہ ناگاہ "یک عشق و ہزار بدگمانی" کے مطابق کچھ خیال آیا فوراً چلا اٹھا "غیر المغضوب علیھم ولا الضالین" اے میرے محبوب! لذت وصال سے آشنا کرکے، اس نعمت سے مشرف فرما کر اتنا اور کیجیو۔ کہ مستقبل کی لغزش سے محفوظ ہو جاؤں ایسا نہ ہو۔ کہ یہ حالت بدل جاوے۔ اور آپ کی رضا کی بجائے غضب کا مورد بن جاؤں۔ اور درِ محبوب میں مقام ہدایت پر ہونے کی بجائے ضلال مبین میں گھر جاؤں۔ اے محبوب آقا! مجھے اس مقام خلد میں دوام بخش۔ نہ آپ مجھے دھتکاریں اور نہ ہی میں عشق سے منہ موڑوں۔ آمین۔

کون سی فطرت صحیحہ ہے جو اس دعا پر، اس عاشقانہ دلسوزی پر صدق دل سے آمین یا رب العالمین نہ پکار اٹھے؟ پس یقیناً سورہ فاتحہ خالق فطرت کا کلام اور فطرت کی آواز ہے۔

جامعیت کلمات

سورۂ فاتحہ کے کلمات نہایت جامع اور وسیع معانی پر مشتمل ہیں اوائل میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کہکر بتایا۔ کہ انسان انانیت سے خالی ہوکر اس کوچہ میں آئے اور پہلا اقرار یہ کرے۔ کہ ہر کام اللہ ہی کے نام سے ہوا اور ہوگا۔ میرا کوئی دخل نہیں۔ میں تو مردہ بدست زندہ ہوں۔ قل ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین
کلمہ "الحمد للہ" میں الحمد مصدر ہے۔ جو فعل مجہول اور معروف دونوں کا مصدر ہے۔ پہلی صورت میں معنی یہ ہونگے۔ کہ اللہ ہی کی حمد کرنی چاہئیے۔ یعنی اللہ کے سوا کوئی مستحق حمد نہیں۔ دوسری صورت میں معنی یوں ہونگے۔ کہ کسی کی حمد کرنا اللہ ہی کو سزاوار ہے۔ یعنی چونکہ عمل کا تعلق نیت سے ہوتا ہے اور نیت بجز اللہ تعالیٰ کوئی نہیں جانتا۔ اس لئے صحیح تعریف وہی ہے جو اللہ کرے بندوں کی تعریف تو بسا اوقات غلط بھی ہو سکتی ہے۔

معزز قارئین! کہ ان دونوں معنوں سے کس قدر وسیع مطالب پیدا ہو جاتے ہیں۔ الحمد کو اگر فعل معروف کا مصدر مانیں۔ تو الحمد للہ کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ اللہ تعالیٰ حمد کرنیوالا اور بندہ محمود ہوتا ہے اور جب کسی کی تعریف بار بار کی گئی ہو تو وہ محمد کہلائیگا اور ایسا شخص ایک ہی ہوا ہے۔ وہ عبداللہ کا فرزند اور آمنہ کا لخت جگر، سید الکائنات محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ پس مقام محمدیت محبوب کا مقام ہے فرمایا۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔

اور اگر الحمد کو فعل مجہول کا مانا جاوے تو معنی یہ ہونگے کہ سب تعریف اللہ ہی کیلئے ہے۔ اس صورت میں بندہ حامد اور اللہ تعالیٰ محمود ہوتا ہے اور جو لوگوں میں سے زیادہ تعریف کرنیوالا ہوگا وہ احمد کہلائیگا پس مقام احمدیت

محب کا مقام اور عاشقانہ منزل ہے۔ الغرض محمد نام جلالی تجلی پر دلالت کرتا ہے اور احمد جمالی پر۔ یہ بیان بہت وسیع ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے رسالہ اعجاز المسیح میں مدلل اور مفصل تحریر فرمایا ہے۔

پھر فقرہ اھدنا الصراط المستقیم میں لفظ ھدایت استعمال ہوا ہے۔ جو ایک جامع لفظ ہے۔ تین طور پر اس کے معنی آئے ہیں۔ (۱) راستہ دکھانا۔ فرمایا واما ثمود فھدینا ھم فاستحبوا العمی علی الھدی (حم السجدہ ع۲) (۲) راستہ پر چلانا فرمایا۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (عنکبوت ع۷) (۳) منزل مقصود تک پہنچانا۔ جیسے فرمایا انک لاتھدی من احببت (قصص ع۶) ماکنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ (اعراف ع۵)

اب دیکھئے۔ اس جامعیت سے کس قدر وسعت پیدا ہو گئی کہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کا انسان یہ دعا مانگ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ غیر محدود، اس کے مدارج غیر محدود اور انسان غیر محدود ترقیات کیلئے پیدا ہوا ہے۔ لہذا گنہگار سے لیکر معصوم نبی تک یہ دعا کر سکتے ہیں۔

پھر اس سورت میں مطلوب خاص چیز نہیں بلکہ "الصراط المستقیم" ہے۔ جو ہر جائز کام کے طریق پر بولا جا سکتا ہے۔ گویا انسان کی جو بھی جائز حاجت ہو۔ دینی ہو یا دنیاوی اس کے لئے یہ دعا مانگی جا سکتی ہے۔ کسی راستہ کی خوبی کا اندازہ تین باتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ وہ راستہ جلد منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہو۔ دوم اس راستہ پر چلکر لوگ کامیاب ہو چکے ہوں۔ سوم۔ اس راستہ کے برخلاف راستہ اختیار کرنیوالے ناکام رہے ہوں۔ سورہ فاتحہ نے جس راستہ کی دعا سکھلائی اسکی خوبی تینوں پہلوؤں سے واضح ہے۔

وہ مستقیم ہے سیدھا راستہ ہے اور سیدھا راستہ ہی مختصر ہوا کرتا ہے۔ اسپر چلنے والے نعمتوں کے وارث ہوئے اور اسکے خلاف جانیوالے مغضوب علیہم اور ضالین بنکر ناکام رہے۔ پس یہ دعا ہر پہلو سے جامع و مانع ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ سورۂ فاتحہ ایک اکمل اور انسان کی تمام ضروریات پر مشتمل ہے۔ اور انسانوں کا کوئی طبقہ ایسا نہیں جو اپنے حالات اور ضروریات کے تحت اس دعا سے مستغنی ہو۔

اسلام کے ارکان

سورۂ فاتحہ اپنے اختصار کے باوجود جن امور پر مشتمل ہے ان میں سے ارکان اسلام بھی ہیں۔ اسلام کے ارکان۔ توحید الٰہی۔ ملائکہ۔ انبیاء۔ کتب سماویہ۔ قیامت اور تقدیر پر ایمان لانا ہے۔ عملی طور پر ادائے شہادت طیبہ۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ اور حج کی ادائگی ہے۔ عملی ارکان کا ذکر فقرہ ایاک نعبد میں فرمایا۔ جس میں قولی اور فعلی ہر قسم کی عبادت شامل ہے۔ اعتقادی ارکان میں سے مسئلہ توحید کو "الحمد للہ رب العالمین" میں ذکر فرمایا۔ رسالت کے تین اجزا ہیں (۱) نبی جو خالق اور مخلوق کے درمیان پیغامبر ہوتا ہے۔ (۲) ملائکہ۔ جو نبی اور خالق کے درمیان واسطہ بنتے ہیں فرمایا وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ مایشاء (شوری ع ۵) (۳) کتب الٰہیہ یعنی وہ پیغام رسالت جو نبیوں کے ذریعہ اہل دنیا کو دیا جاتا ہے۔

یہ ہر سہ پہلو صفت رحمانیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ نبیوں کی بعثت بھی انہی صفت کا نتیجہ ہے فرمایا واذا قیل لھم اسجدوا للرحمن قالوا وما الرحمن انسجد لما تامرنا وزادھم نفورا (فرقان ع ۵) ملائکہ بھی صفت رحمانیت کا ظہور ہیں فرمایا ما یمسکھن الا الرحمن (الملک) کتب بھی رحمانیت کا ظہور ہیں

فرمایا الرحمٰن علّم القرآن (الرحمٰن) رسالت کے تینوں اجزاء کو سورۂ فاتحہ
نے صراط الذین انعمت علیہم میں ذکر فرمایا ہے۔ پھر یوم القیامت کے
اعتقاد کو مالک یوم الدین میں بیان کیا۔ اور آخری حصہ سورۃ میں مسئلہ تقدیر
کی وضاحت کی اور وہ یوں کہ تین چیزوں نعمت. غضب اور ضلال کا ذکر کیا۔ لیکن
ایسے انداز سے ذکر کیا۔ کہ ایمان بالقدر خیرہ وشرہ کی حقیقت ظاہر ہو جاوے۔
جب نعمت کا ذکر فرمایا تو انعمت کہا کہ نعمت تو نے دی انعام تو نے کیا۔ لیکن
غضب اور ضلالت کے ذکر پر انکو اللہ کی طرف منسوب نہیں کیا۔ بلکہ فرمایا۔ غیر
المغضوب علیہم ولا الضالین ان پر غضب کیا گیا۔ وہ گمراہ ہو گئے جسمیں
صاف اشارہ کر دیا۔ کہ غضب آلہی ان کے اعمال کا نتیجہ تھا۔ گمراہی انہوں نے خود
اختیار کی۔ ان اضافتوں میں نیکی کا مصدر اللہ تعالیٰ اور بدی کا منبع خود انسان کو
بتایا ہے۔ اور مقام ادب بھی یہی چاہتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم کہتے ہیں۔
واذا مرضت فھو یشفین (شعراء ع ۵) مرض کو اپنی طرف منسوب کیا اور شفا کو اللہ تعالیٰ
کیطرف۔ لیکن اس ایضاح کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے نعمت پانے مغضوب
علیہم اور ضالین بننے سے بچانیکی دعا سکھانے میں ظاہر کر دیا کہ بلحاظ نتیجہ کے
ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ گویا عمل انسان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسکا نتیجہ ظاہر
کرتا ہے۔ اس لئے خیر و شر انسان کی طرف بلحاظ عامل کے منسوب ہوتا ہے۔
اور اللہ تعالیٰ کی طرف بلحاظ نتیج اور جزاء مرتب کرنیوالے کے۔ لیکن چونکہ نیک
نتائج اللہ تعالیٰ بڑھا کر دیتا ہے اور بدیوں کو معاف کر دیتا ہے اگر سزا بھی دے
تو بدی کے برابر نہ کہ زیادہ۔ اس لئے عقلاً اور نیز مقام ادب کے لحاظ سے یہ کہنا بھی
عین موزون ہے۔ کہ نیکی اللہ کیطرف سے اور بدی انسان کی طرف سے ہوتی ہے
غرض مسئلہ تقدیر کو بھی دونوں پہلوؤں سے سورہ فاتحہ نے بیان کر دیا ہے۔ اور

اور اس طرح سے تمام ارکانِ اسلام کا بیان سورۂ فاتحہ میں موجود ہے۔

دعویٰ اور دلیل

سورۂ فاتحہ میں انبیات کا التزام کیا گیا ہے کہ ہر بیان پر برہان اور ہر دعویٰ کی دلیل ذکر کیجاوے۔ یونتو یہ طریق سارے قرآن مجید اور سورۂ فاتحہ کے ایک ایک لفظ میں موجود ہے۔ لیکن یہ ایک لمبا مضمون ہے ہم محض نمونہ کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ دیکھئے۔ "الحمد للہ" ایک دعویٰ ہے۔ اس کا ثبوت اوّل تو لفظ "اللہ" لکھکر دیا۔ کیونکہ اللہ اُس ذات کا نام ہے جو تمام خوبیوں کی جامع اور تمام عیبوں سے منزہ ہو۔ اس لئے الحمد للہ برحق ہے۔ دوسرے اس کے بعد چار صفات ذکر کئے جن میں سے ہر ایک اس دعویٰ کی دلیل ہے۔ کیونکہ حمد۔ ربوبیت۔ رحمانیت رحیمیت اور مالکیت کی بنا پر ہو سکتی ہے۔ اور یہ صفات کامل طور پر اللہ میں موجود ہیں۔ لہذا الحمد للہ کا دعویٰ مدلل و مبرہن ہو گیا۔ اب اس دعویٰ کا نتیجہ یا اس کی فرع ایاک نعبد ہے۔ سوال ہوتا ہے کیوں عبادت کریں۔ پہلا جواب یہ ہے الحمد للہ۔ اس کا جامع محامد ہونا چاہتا ہے۔ کہ ہم اس کی عبادت کریں دوسرا جواب یہ دیا۔ وایاک نستعین۔ ہم اس کی مدد کے محتاج ہیں۔ عبادت مدد طلب کرنے کا ذریعہ ہے۔ پھر اس دعوے کا کیا ثبوت ہے۔ کہ ہم اس کی مدد کے محتاج ہیں۔ دلیل میں فرمایا اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین یعنی اول تو تم اپنے علم کو دیکھو۔ کہ محدود اور ناقص ہے۔ تم اپنی علمی رہنمائی کے لئے اللہ تعالےٰ کے محتاج ہو۔ اس لئے کہو۔ کہ اے خدا ہمیں صراط مستقیم دکھا۔ فرمایا ویسئلونک عن الروح قل الروح

من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً۔ (بنی اسرائیل ع ۱۰)
پھر بتایا۔ کہ عملی طور پر بھی تم محتاج ہو۔ دیکھ لو۔ کہ جنھوں نے اس احتیاج
سے بے پرواہی کی۔ کس طرح گمراہ اور مورد غضب بن گئے۔ اور جو اس
کے دامن سے وابستہ رہے۔ وہ نعمتوں کے وارث بن گئے۔ پس تم
علمی اور عملی زندگی میں اس کے محتاج ہو۔ اس لئے اس کی عبادت کرو۔
کیونکہ وہی الحمد للہ کا مصداق ہے۔

غور فرمائیے۔ کہ کس طرح سے ایک لفظ دوسرے کی دلیل کے طور
پر اور نہایت مرتبط واقع ہوا ہے۔

تعلیمِ اخلاق

نیکی کی تعریف میں علماء عصر جدید کا شدید اختلاف
ہے۔ اللہ تعالے نے "الحمد للہ" کہہ کر نیکی
کی صحیح تعریف فرما دی۔ یعنی چونکہ اللہ تعالے کی ذات ہی ہر خوبی کا
منبع ہے۔ اس لئے جو عمل اس کی صفات کے مطابق اور اس کے
رنگ میں رنگین ہو وہ نیکی ہے۔

بعد ازاں صفات الٰہیہ ذکر کر کے نیکی کا معیار بیان کر دیا۔ اور
اخلاق کا پیمانہ بتلا دیا۔ تخلقوا باخلاق اللہ۔ انسانی مقدرت کے
مطابق تم یہ صفات اپنے اندر پیدا کرو۔ صاحب اخلاق فاضلہ بنجاؤ گے
تم اپنے دائرہ کے اندر ربوبیت کرو۔ اور اُسے وسیع کرتے کرتے اگر
عملاً نہیں تو دلی طور پر تو رب العالمین کے مظہر بن جاؤ۔ پھر رحمانیت
کے رنگ کو اختیار کرو۔ بغیر کسی تعلق کی بنا ء کے احسان کرو۔ پھر
رحیمیت کے تجلی گاہ بنو۔ پھر مالکیت کو اپنے لئے نمونہ بناؤ۔ درحقیقت
جب تک انسان ان صفات کی نقل نہ کرے۔ اس کے اخلاق کامل ہی نہیں

نہیں سکتے - انہی صفات کی اتباع کے طور پر اللہ تعالےٰ دوسری جگہ فرماتے ہیں - ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ (النحل ع۱۳) انسانی صفات تنگ دائرہ سے وسعت کی طرف جاتے ہیں - اور سورۃ فاتحہ میں مذکورہ صفات الٰہیہ اُوپر سے نیچے کی طرف یعنی غیر معمولی وسعت سے محدودیت کی طرف آتے ہیں جس میں یہ رمز ہے - کہ انسان عبادات کے ذریعہ قرب الٰہی میں ترقی کرتا ہے - لیکن بندہ کی عبادت اللہ تعالےٰ کی شان کو بلند نہیں کرتی - بلکہ وہ انسان کے قریب ہو جاتا ہے - اسی لئے سورۃ فاتحہ میں آخری صفت مالک یوم الدین ذکر کی - اور اخلاقی درس میں اس کے مطابق پہلا زینہ عدل قرار دیا - کیونکہ مالکیت کا ادنیٰ ظہور عدل میں ہوتا ہے

الرحیم اور الرحمٰن دراصل احسان کے ہی دو درجے ہیں - رحیمیت کے مقام پر احسان ان لوگوں پر کیا جاتا ہے - جنھوں نے کچھ کیا ہے - لیکن رحمانیت کا احسان عام اور ہمہ گیر ہوتا ہے - انسانی اخلاق کی ترتیب میں دوسرا درجہ "الاحسان" ذکر فرمایا - جس کی دونوں شقیں ہیں - اخلاق کا آخری اور اعلیٰ زینہ ایتاء ذی القربیٰ کا مقام ہے یعنی اول تو احسان کا دائرہ بہت ہی وسیع ہو - دوسرے محسن کے دل میں خیال تک بھی نہ ہو - کہ میں نے کوئی احسان کیا ہے - یہ درجہ اللہ تعالیٰ کی صفت رب العالمین کے بالمقابل ہے - غرض انسانی اخلاق کا معیار صفات الٰہیہ ہیں - ان کی اصلاح ذریعہ صفات الٰہیہ پر تدبر کرنا ہے - اور ان کی نشوونما اور تکمیل بھی اسی ذریعہ سے ہوتی ہے - یہی وہ مقام ہے جو درحقیقت السلوک من اللہ - السلوک الی اللہ اور السلوک فی اللہ

کا مقام اور انسانیت کا معراج ہے۔ یہ جگہ بہت کچھ تفصیل طلب ہے۔ مگر مجھے اختصار مدنظر ہے۔ اس لئے میں قارئین کرام سے سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتاب "اسلامی اصول کی فلاسفی" کے بغور پڑھنے کی درخواست پر اس عنوان کو بند کرتا ہوں۔

دنیا کا امن

خاندان۔ قوموں۔ مذاہب اور حکومتوں میں جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ لڑائیاں ہوتی ہیں۔ کشت و خون اور خونریزیاں ہوتی ہیں دنیا کا امن برباد ہوتا ہے۔ مگر یہ سب فسادات سورۃ فاتحہ کی سمجھنے سے کافور ہو جاتے ہیں۔

انسان اپنے بھائی میں عیب دیکھتا ہے۔ اپنے بچوں میں نقص پاتا ہے۔ اپنی بیوی میں کمزوری دیکھتا ہے۔ اپنے دوستوں کی بعض کوتاہیوں سے مطلع ہوتا ہے کڑھتا ہے غمگین ہوتا ہے اس کا فرض ہے۔ کہ اصلاح کی کوشش کرے۔ لیکن وہ غضبناک ہو جاتا ہے۔ اور ان سے بدسلوکی بدزبانی اور مارپیٹ سے پیش آتا ہے۔ جس سے مرض بڑھتا جاتا ہے۔ اور یہ شخص اپنے لئے دوزخ تیار کرتا رہتا ہے۔ اگر اس کی بات نہیں مانی جاتی۔ تو برافروختہ ہو کر آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے۔ اور انتقامی رنگ میں جس طرح اظہار غضب کر سکے کرتا ہے۔ اگر اُسے کوئی صدمہ یا غم یا نقصان پہنچتا ہے۔ تو مایوسی سے مردہ ہو جاتا ہے غرض اس قسم کے سینکڑوں شعبے ہیں۔ جن میں افراد اور خاندان روزمرہ مبتلا ہوتے ہیں۔ اور بیجا طیش۔ غضب انانیت اور ناامیدی سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیتے ہیں۔ اگر وہ لوگ "الحمد للہ" کے پُرلذت فقرہ پر غور کریں تو ان کا دُکھ سکھ سے بدل جاوے عیبوں۔ نقصوں اور کمزوریوں سے اللہ کی ذات ہی پاک ہے۔ ہر شخص میں

کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ اس لئے وسعت حوصلہ اور رواداری سے کام لینا چاہیئے۔ اور اپنے آپ کو غلطی سے مُبّرا اور مقام الوہیت پر سمجھ کر یہ خواہش نہ کرنی چاہیئے۔ کہ میری ہر بات درست ہو اور بلا چون وچرا مانی جاوے۔ مصائب اور آفات پر گھبرانا نہ چاہیئے۔ بقا اللہ تعالیٰ کو ہی ہے وہ جو بھی کرتا ہے۔ انسان کے لئے مفید ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے لئے تو خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔ اس کا ہر فعل مستحق حمد ہے۔ الحمد للہ۔ فرمایا عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم۔

یہ تو الحمد سے تسلی کا ذریعہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی پورے زور سے اصلاح نفس اور تزکیۂ قلوب کی طرف بھی الحمد للہ توجہ دلا رہی ہے۔ کیونکہ اللہ قدوس ہے۔ اور وہ پاکوں کو ہی پسند کرتا ہے۔ غرض تمام خاندانی قسم کے جھگڑوں کا مختصر علاج الحمد للہ میں موجود ہے:۔

قوموں میں کشمکش ہوتی ہے۔ وطنیت کے جھگڑے ہوتے ہیں سفید قوموں کی افضلیت منوانے کے لئے خونریزیاں ہوتی ہیں۔ ایک قوم دوسری قوم کے مٹانے پر تُلی ہوئی ہے۔ غیروں کے بغض و عداوت اور دشمنی سے سینے معمور ہیں۔ گویا خدا کی زمین پر انسان نہیں درندے ہی درندے ہیں۔ اگر یہ لوگ سورۂ فاتحہ کا فقرہ "رب العلمین" ہی مدنظر رکھیں۔ تو دشمنی محبت سے بدل سکتی ہے۔ گورے ہوں یا کالے ہوں۔ مشرقی ہوں یا مغربی ہوں۔ اسرائیلی ہوں یا غیر اسرائیلی۔ سب کا ایک ہی رب ہے۔ سب اسی کے بندے ہیں۔ بھائی بھائی ہیں۔ ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔ اگر دنیا اس پاکیزہ اور عالمگیر نظریہ کو اختیار کرلے۔ تو تمام قومی فسادات کافور ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں کمزور قوموں سے نفرت نہیں ہمدردی

پیدا ہو گی۔ اور پسماندہ کو دبانے کی نہیں اُبھارنے کی کوشش کی جائے گی۔ کیا ہی پیارا تصور ہے۔ اے کاش کہ وطنیت و قومیت کے متوالے اس تعلیم پر غور کریں۔

مذاہب میں اختلاف ہے۔ اور اس اختلاف کو کینہ توزی کا ذریعہ اور بنارِ مخاصمت بنا لیا گیا ہے۔ ایک مذہب کے لوگ دوسرے مذہب کے بانی اور اس کے مقدسوں کی تحقیر کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ فسادات کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ اور امن ہٹ جاتا ہے۔ ہر مذہب کے لوگ اپنے مذہب کے لئے ایسی غیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ کہ دوسروں کو جبراً و قہراً اپنے مذہب میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ باتیں امن کی مخالف اور لڑائی کا ذریعہ ہیں۔ سورۂ فاتحہ مذاہب کے درمیان صلح کراتی ہے۔ کیونکہ وہ کہتی ہے کہ اے متعصب انسان! کیا تو نہیں جانتا۔ کہ خدا رب العالمین ہے۔ وہ سب قوموں سارے ملکوں کی تربیت کرتا ہے تو تُو کیوں اس کی روحانی فیض رسانی کو اپنی قوم یا اپنے ملک میں محدود قرار دے کر دوسرے مذاہب کے بانیوں کو جھوٹا کہتا ہے۔ ان کی تحقیر کرتا۔ اور خرمن کو برباد کر رہا ہے۔ یاد رکھ کہ خدا نے ہر قوم میں نبی بھیجے ہیں اور ہر ملک میں اس کے پیغمبر گذرے ہیں۔ اور یہ ہو کیونکر سکتا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ ان دوسری قوموں کی جسمانی تربیت تو کرتا۔ مگر روحانی تربیت نہ کرتا۔ پس اُٹھ اور ہر مذہب کے بانی کی عزت و توقیر کر۔ اپنے تاریک کنوئیں سے نکل کر عالمگیر سمندر کا نظارہ کر۔

یہ وہ اصل ہے جو تمام مذاہب میں صلح کرا سکتا ہے۔ اور مذہبی دُنیا سے فتنہ کی آگ کو بُجھا سکتا ہے۔ ایک سچا مسلمان تو دنیا کے ہر نبی کو مانتا

ہے۔ مگر افسوس کہ ابھی تک دوسرے مذاہب کے پیرو اس طریق کو اختیار نہیں کرتے تا فسادات مٹ جاویں۔

پھر اللہ تعالےٰ نے اس لفظ میں بتایا ہے۔ کہ میں دہریہ اور ذات باری کو گالیاں دینے والوں کی بھی ربوبیت کر رہا ہوں۔ کیا تم میرے لئے، میرے دین کے لئے مجھ سے بھی زیادہ غیور ہو۔ جو دنیا میں جبر کرنا چاہتے ہو۔ گویا اس ایک لفظ میں مذہبی لوگوں کے فسادات کا صحیح علاج پیش کیا ہے۔

حکومتیں طاقت اور قوت پا کر رعایا پر ظلم کرتی ہیں۔ رعایا بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ حکومت بے جا ٹیکس اور طاقت سے زیادہ مالی بوجھ لاد کر اپنے خزانے پُر کرنا چاہتی ہے اور غریب و مفلسوں کی خیر گیری سے لاپرواہی برتتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ مزدور اور ملک والے حکومت کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں اور بالشویکی وغیرہ تحریکات سے نظام کو درہم برہم کرنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ فسادات اور خونریزیاں ہوتا ہے۔ پھر طاقتور حکومتیں کمزور حکومتوں کو تباہ کرنے کے درپے ہو جاتی ہیں۔ اور جنگیں شروع ہو جاتی ہیں۔

اگر حکومت والے یہ سمجھیں کہ ان کے اُوپر بھی مالک یوم الدین موجود ہے تو وہ کبھی ظلم نہ کریں۔ اور کمزور کو تباہ کرنے کے منصوبے نہ باندھیں۔ نیز اگر وہ یہ جانیں۔ کہ خدا تعالےٰ نے باوجود خالق ہونے کے نظام عالم کی بنیاد ربوبیت۔ رحمانیت اور رحیمیت پر رکھی ہے تو کبھی رعایا تشدد کا نشانہ نہ بنائیں۔ بلکہ لطف و مدارات اور جمہوریت کے طریق پر دنیا میں نظام قائم کریں۔ تا امن و امان ہو۔ نہ ظلم ہو نہ فسادات ہوں۔

فقیروں کی سوکھی روٹی چھین کر عیش وعشرت کرنے والوں کی فضول خرچیوں
میں اضافہ نہ کیا جاوے۔ اور نہ شیوعیت وغیرہ تحریک کا آغاز ہو۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر خاندان کے لوگ، مذاہب کے پیرو، قوم کے
افراد، اور حکومتوں کے ارکان سورۂ فاتحہ کو اپنا دستور العمل بنالیں تو فوراً
فساد مٹ کر امن قائم ہو سکتا ہے۔ پس سورۂ فاتحہ قیام امن کا بہترین
ذریعہ ہے۔

قبولیتِ دعا کا طریق

سورۂ فاتحہ صرف بہترین دعا ہی نہیں۔ بلکہ
اس میں دعا کی قبولیت کا اصولی طریق بھی بتلایا
گیا ہے۔ جس کی چار شقیں ہیں (الف) صفات الٰہیہ پر پورا تدبر کرنا حتی کہ
اللہ تعالے سامنے نظر آجاوے۔ کیونکہ جب تک انسان کو اللہ تعالیٰ کی
قدرت اور اس کی طاقتوں اور اسکی مہربانیوں کا صحیح علم نہ ہو۔ اس کے دل میں
مانگنے کی پوری خواہش پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ دنیاوی فقیر بھی اس
دروازہ پر جانا نہیں چاہتا۔ جہاں سے خیرات ملنے کے متعلق اسے شک
ہو۔ اسی امر کو اللہ تعالے نے دوسری جگہ "ولیومنوابی" کے لفظ سے
ذکر فرمایا ہے۔ اور سورۂ فاتحہ میں قدرت۔ طاقت اور رحمت کی صفات
کو ابتداء میں ذکر کرنے میں یہ حکمت بھی ہے۔ (ب) بنی نوع انسان
کی ہمدردی دعا کرنے والے میں موجود ہو۔ اور جتنا جتنا کوئی انسان ہمدردی
خلق میں بڑھتا جائے گا۔ اس کی دعا شرف قبولیت حاصل کرتی جائیگی
سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالے نے دعا کرنے والے کے منہ سے جمع کے
صیغے نکلوا کر اس طرف رہنمائی فرمائی ہے۔
(ج) انسان اپنی مقدور بھر کوشش بھی کرے۔ دعا انسان کو بے کار

اور معطل کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس کی استعدادوں اور قوتوں کو منصۂ شہود پر لانے کے لئے ہے۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے دعا کے الفاظ سے پہلے انسان سے ایاک نعبد کا اقرار لیا۔ یعنی میں مقدور بھر تیری قوانین کی اطاعت کر رہا ہوں۔

(د) ان کوششوں پر انحصار نہ کرے۔ کوشش کرے۔ مگر یہ نہ گمان کرے۔ کہ نتیجہ کوشش کا ثمرہ ہے۔ بلکہ اُسے اللہ تعالےٰ کی بخشش و رحمت منحصر سمجھے۔ کیونکہ اس کی مدد و نصرت کے بغیر ہزارہا کوششیں بے ثمر رہجاتی ہیں۔ اس مقام کا نام مقام توکل ہے۔ اور سورۂ فاتحہ نے جُملہ وایاک نستعین میں اسی بات کو ذکر کیا ہے۔

جب انسان ان چاروں مرحلوں کو طے کر لیتا ہے۔ تو اس کا حق ہے کہ کہے۔ اھدنا الصراط المستقیم اور اندریں صورت اس کی دعا مقبول ہوتی ہے اور اللہ تعالےٰ کے عرش تک پہنچتی ہے ؛

اُمید کی زندگی

انسانی زندگی امید پر مبنی ہے "زندگی بامید قائم"۔ جب امید جاتی رہے اور مایوسی انسان کا احاطہ کرلے۔ تو انسان موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔ اور زندگی سے بیزار ہوجاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس مقام پر بہت سے لوگ خودکشی کر لیتے ہیں۔ جسمانی مصائب سے تنگ آکر امید سے محروم ہوکر جسمانی زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں۔ اور روحانی دنیا میں بھی جب انسان نعمت امید سے محروم ہوجاوے۔ تو وہ روحانی خودکشی کر لیتا ہے۔ گناہوں کی معافی کی امید نہ رہی۔ گناہوں میں منہمک ہوگئے اور آہستہ آہستہ قیامت اور ذات باری کے بھی منکر ہو بیٹھے۔ روحانیت مر گئی اور گناہوں میں غرق ہوگئے

(یوسف ع۱۲) اَدعُوا اِلی اللہ علی بصیرۃ انا و من اتبعنی
گویا سورۃ فاتحہ امید کا دروازہ کھولتی اور یقین تک پہنچا دیتی ہے۔ اس لئے حقیقی مقام ہے فرمایا
اوّل غائب ہستی کا ذکر ہے اور پھر مخاطب کا۔ خدا میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ مگر بندہ امید کی دھندلی سی جھلک کی بجائے یقین کے آفتاب کی روشنی میں آگیا ہے۔

سورۃ فاتحہ کی پیشگوئی

سورۃ فاتحہ کو اگر پیشگوئی کی حیثیت سے دیکھا جائے تو مختصر طور پر مندرجہ ذیل پہلو اس پیشگوئی کے ہیں۔

(الف) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دعا سکھلائی۔ کہ اے خدا ہمیں مغضوب علیہم اور ضالین نہ بنا۔ مغضوب علیہم اور ضالین کی تفسیر آنحضرت صلعم نے یہود اور نصاریٰ بیان فرمائی ہے (اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۹۰) سورۃ فاتحہ مکیہ ہے اور مکہ میں آنحضرت صلعم کے سامنے مشرکین تھے۔ لیکن دعا میں مشرکین کا لفظ نہیں رکھا جاتا۔ جس سے ایک تو یہ ظاہر ہے۔ کہ یہ سورۃ آنحضرت کا انتخاب نہیں بلکہ خدائی کلام ہے۔ اگر آنحضرتؐ خود بناتے۔ تو پہلے مشرکین کا لفظ رکھتے۔ دوسرے اس میں درحقیقت یہ پیشگوئی ہے۔ کہ مشرکین تو آپ کی زندگی میں ہی ختم ہو جاویں گے اور مسلمان خواہ کتنا بھی بگڑ جاویں اس شرک کی طرف رجوع نہ کریں گے۔ ہاں یہود و نصاریٰ کا فتنہ باقی رہے گا۔ پیشگوئی کا یہ پہلو آنحضرت صلعم کی حیات مبارک میں ہی پورا ہو گیا۔

(ب) احادیث سے ثابت ہے۔ کہ دجال کا فتنہ ابتداء خلقت سے لے کر قیامت تک کے تمام فتنوں سے بڑا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ میں دجال کے فتنہ سے بچنے کی دعا نہیں سکھلائی۔ جس میں یہ پیشگوئی ہے۔ کہ دجال انہیں میں سے ہوگا۔ اور دوسری جگہ یہ بتا کر کہ یہود ہمیشہ کیلئے دنیاوی اقتدار سے محروم ہیں اور نصاریٰ کا خدا کے لئے بیٹا قرار دینا سب سے بڑا فتنہ

مذکورہ حقیقی مقام ہے فرمایا ادعو الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی (یوسف ع ۱۲)

گویا سورۂ فاتحہ امید کا دروازہ کھولتی اور یقین تک پہنچا دیتی ہے۔ اس لئے اوّل غائب ہستی کا ذکر ہے اور پھر مخاطب کا۔ خدا میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ مگر بندہ امید کی دھندلی سی جھلک کی بجائے یقین کے آفتاب کی روشنی میں آگیا ہے۔

سورۂ فاتحہ کی پیشگوئی

سورۂ فاتحہ کو اگر پیشگوئی کی حیثیت سے دیکھا جائے۔ تو مختصر طور پر مندرجہ ذیل پہلو اس پیشگوئی کے ہیں۔

(الف) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دعا سکھلائی۔ کہ اے خدا ہمیں مغضوب علیہم اور ضالین نہ بنا۔ مغضوب علیہم اور ضالین کی تفسیر آنحضرت صلعم نے یہود اور نصاریٰ بیان فرمائی ہے (اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۹۰) سورۂ فاتحہ مکیہ ہے اور مکہ میں آنحضرت صلعم کے سامنے مشرکین تھے۔ لیکن دعا میں مشرکین کا لفظ نہیں رکھا جاتا۔ جس سے ایک تو یہ ظاہر ہے۔ کہ یہ سورۃ آنحضرت کا انتخاب نہیں بلکہ خدائی کلام ہے۔ اگر آنحضرتؐ خود بناتے۔ تو پہلے مشرکین کا لفظ رکھتے۔ دوسرے اس میں درحقیقت یہ پیشگوئی ہے۔ کہ مشرکین تو آپ کی زندگی میں ہی ختم ہو جاوینگے اور مسلمان خواہ کتنا بھی بگڑ جاویں اس شرک کی طرف رجوع نہ کریں گے۔ ہاں یہود و نصاریٰ کا فتنہ باقی رہے گا۔ پیشگوئی کا یہ پہلو آنحضرت صلعم کی حیات مبارک میں ہی پورا ہو گیا۔

(ب) احادیث سے ثابت ہے۔ کہ دجال کا فتنہ ابتدا خلقت سے لے کر قیامت تک کے تمام فتنوں سے بڑا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں دجال کے فتنہ سے بچنے کی دعا نہیں سکھلائی۔ جس میں یہ پیشگوئی ہے۔ کہ دجال انہیں میں سے ہوگا۔ اور دوسری جگہ یہ بتا کر کہ یہود ہمیشہ کیلئے دنیاوی اقتدار سے محروم ہیں اور نصاریٰ کا خدا کے لئے بیٹا قرار دینا سب سے بڑا فتنہ

ہے۔ (مریم) تصریح فرمادی۔ کہ دجال نصاریٰ کا ہی ایک گروہ ہے۔ اور چونکہ دجال کا خروج آخری زمانہ سے متعلق تھا۔ اس لئے اس لفظ کو بھی اخیر پر رکھا۔

(ج) الضالین سے بچنے کی دعا سکھلا کر یہ بتا دیا۔ کہ اس فتنہ سے بچنے کا واحد ذریعہ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے۔ لا یدان لاحد بقتالھم

(د) مسلمانوں کو اس دعا کے تلقین کرنے میں ایک یہ بھی پیشگوئی تھی۔ کہ ایک وقت وہ بھی یہود و نصاریٰ کے قدم پر چلیں گے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے "لتتبعن سنن من قبلکم" (بخاری) اے مسلمانو! تم پہلے لوگوں کے طریق عمل پر چلو گے اور دوسری جگہ تصریح فرمائی۔ کہ جس طرح یہود کے ۷۲ فرقے ہو گئے تھے۔ اسی طرح میری امت کے ۷۳ فرقے ہو جاویں گے اور میری امت یہود سے مشابہت تامہ اختیار کرلیگی۔ حتیٰ کہ جسطرح ایک جوتی دوسری کے مشابہ ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک دوسرے کے ہمرنگ ہو جائینگی (ترمذی)

سورۂ فاتحہ میں دعا سکھلائی۔ کہ اے خدا ہمیں یہود کے طریق سے بچا۔ اور نصاریٰ کے راستہ سے بھی محفوظ رکھ۔ یہود و نصاریٰ دونوں قومیں راندۂ درگاہ ہیں۔ لیکن دنیاوی حیثیت سے ان میں فرق ہے۔ یہود نے انبیاءؑ کی تکذیب میں بے حد سرکشی و طغیان اختیار کیا اور اس طریق کو حضرت مسیح کے متعلق تو انتہا تک پہنچا دیا۔ اس لئے ان کی سزا بھی سخت ہوئی۔ یعنی روحانی اور دنیاوی نعمت دونوں سے محروم ہو گئے۔ نبوت اور بادشاہت دو نعمتیں ان میں تھیں۔ واذ قال موسیٰ لقومہ یا قوم اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء و جعلکم ملوکا (مائدہ ع۴) اور ان کی شرارتوں کے باعث دونوں چھین لی گئیں۔ جیسا کہ آیت لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علی لسان

…ۃ داؤد و عیسی بن مریم ذالک بما عصوا و کانو یعتدون (رکوع ۱۱)
مذکور ہوا ہے۔ نصاری نے مسیح کی شان میں غلو کیا اور آنحضرت صلعم پر ایمان
نہ لائے۔ یہ بہت بڑا جرم ہے۔ مگر ایمان و عدم ایمان کی جزا و سزا کے لئے تو قیامت
کا دن مقرر ہے۔ اس لئے نصاری بارگاہِ ایزدی سے دھتکارے گئے روحانی نعمت
سے محروم ہو گئے۔ مگر دنیا ان کے ساتھ رہی اور وہ دنیا پر ہی مطمئن ہو بیٹھے۔

ایک مسلمان جب غیر المغضوب علیہم و لا الضالین کہتا ہے تو گویا
یہ کہتا ہے۔ کہ اے خدا ہمیں یہود کے طریق سے بچا۔ ہم تیرے مسیح موعود
کی تکذیب نہ کر بیٹھیں اور دینی و دنیوی نعمتوں سے محروم نہ ہو جاویں۔ نیز ہمیں
نصاری کی راہ سے بھی بچا۔ ہم غلو و افترا سے کام نہ لیں اور روحانی نعمت سے
محروم ہو کر دنیا پر قانع نہ ہو بیٹھیں۔ یعنی افراط و تفریط سے بچا۔ خیر الامور اوسطہا

(د) اللہ تعالے نے دعا صراط الذین انعمت علیہم میں پیشگوئی
فرمائی ہے۔ کہ جو انعامات پہلی امتوں کو دئے گئے وہ سب امت محمدیہ کو دئے جائینگے
اس آیت کی تفسیر مفسرین نے بھی سورۃ النساء کی آیت ومن یطع اللہ
والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین و
الصدیقین والشہداء والصالحین سے کی ہے۔ (دیکھو اتقان
جلد ۲ ص ۱۹ و مفتی محمد عبدہ کی تفسیر الفاتحہ ص ۳۸)

جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اللہ تعالے نے سورۃ فاتحہ میں خبر دی ہے
کہ امت محمدیہ میں صالح۔ شہید۔ صدیق۔ اور نبی پیدا ہوتے رہیں گے
اور مسیح موعود بھی امت محمدیہ سے ہی ہوگا۔ کیونکہ جس طرح امت یہود کے
رنگ میں ہوگی۔ اسی طرح آنحضرت صلعم کا ہی ایک امتی مسیح موعود ہوگا۔ اب
ساری نعمتیں امت محمدیہ کے لئے ہیں۔ پس مسیح اسرائیلی کے اس جگہ آنیکی

گنجائش نہیں۔ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں:-
" اس دعا میں یہ پیشگوئی مخفی ہے۔ کہ بعض مسلمانوں میں سے ایسے
ہوں گے۔ کہ وہ اپنے صدق و صفا کی وجہ سے پہلے نبیوں کے وارث
ہو جائیں گے اور نبوت اور رسالت کی نعمتیں پائینگے۔ اور بعض
ایسے ہوں گے۔ کہ وہ یہودی صفت ہو جائیں گے۔ جن پر دنیا
میں ہی عذاب نازل ہوگا۔ اور بعض ایسے ہوں گے کہ وہ عیسائیت
کا جامہ پہن لیں گے۔ کیونکہ خدا کی کلام میں یہ سنت مستمرہ ہے
کہ جب ایک قوم کو کسی کام سے منع کیا جاتا ہے۔ تو ضرور بعض
ان میں سے ایسے ہوتے ہیں۔ کہ خدا کے علم میں اس کام کے
مرتکب ہونے والے ہوتے ہیں۔ اور بعض ایسے ہوتے ہیں۔
کہ وہ نیکی اور سعادت کا حصہ لیتے ہیں۔ ابتدار دنیا سے اخیر
تک جس قدر خدا نے کتابیں بھیجیں ان تمام کتابوں میں خدا تعالیٰ
کی یہ قدیم سُنت ہے۔ کہ جب وہ ایک قوم کو ایک کام سے
منع کرتا ہے۔ یا ایک کام کی رغبت دیتا ہے۔ تو اس کے علم میں
یہ مقدر ہوتا ہے۔ کہ بعض اس کام کو کریں گے اور بعض نہیں۔ پس
یہ سورۃ پیشگوئی کر رہی ہے۔ کہ کوئی فرد اس امت میں سے کامل
طور پر نبیوں کے رنگ میں ظاہر ہوگا۔ تا وہ پیشگوئی جو آیت صراط
الذین انعمت علیہم سے مستنبط ہوتی ہے۔ وہ اکمل اور اتم طور
پر پوری ہو جائے۔ اور کوئی گروہ ان میں سے ان یہودیوں کے
رنگ میں ظاہر ہوگا۔ جن پر حضرت عیسیٰ نے لعنت کی تھی۔ اور
وہ عذاب الٰہی میں مبتلا ہوئے تھے۔ تا وہ پیشگوئی جو آیت

...ضیر المغضوب علیھم سے مستنبط ہوتی ہے۔ ظہور پذیر ہو۔ اور کوئی گروہ ان میں سے عیسائیوں کے رنگ میں ہوجائیگا ...عیسائی بن جائیگا۔ جو خدا کی رہنمائی سے بوجہ اپنی شرابخوری اور اباحت اور فسق و فجور کے بے نصیب ہو گئے تا وہ پیشگوئی جو آیت ولا الضالین سے مترشح ہو رہی ہے۔ ظاہر ہو جائے " (کشتی نوح صہ۱۳)

...غرض سورۂ فاتحہ ایک عظیم الشان پیشگوئی پر مشتمل ہے۔ جس کے ...مختلف پہلو ہیں۔ اور وہ پیشگوئی ہر پہلو سے پوری ہو چکی۔ دجّال کا ظہور ہو چکا۔ ایک طبقہ عیسائیوں کے جال میں پھنس گیا۔ اسی طبقہ کا ایک فرد پادری پال صاحب ہیں۔ اُمت یہود کے نقشِ قدم پر چل رہی ہے۔ جس کا اعتراف ہر خورد و کلاں کر رہا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ...مرحومہ کے حال پر رحم فرما کر کشتیٔ اسلام کو منجدھار سے نکالنے ...لئے حضرت مرزا غلام احمدؐ قادیانی علیہ السلام کو مسیح موعود اور مہدی معہود بنا کر مبعوث فرمایا۔ اور اس طرح سورۂ فاتحہ کی پیشگوئی مکمل طور پر پوری ہو گئی۔ مبارک وے جو حق کے طالب اور اس کے جویاں ہوں اور خدا کے فرستادہ پر ایمان لاکر رحمت الٰہی کے وارث ہوں۔

سورۂ فاتحہ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کی مثال سمندر ...میں سے قطرہ بھی نہیں۔ لیکن تاہم اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ دعا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ اس رسالہ کو سعید روحوں کے لئے نافع اور مفید بنا دے۔ آمین۔

اب میں سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے پاکیزہ کلمات پر

پر اس رسالہ کو ختم کرتا ہوں۔ حضور تحریر فرماتے ہیں:۔
"مجھے قسم ہے اس ذات کی جسکے ہاتھ میں میری جان ہے۔ کہ اگر مسیح ابن مریم میرے زمانہ میں ہوتا۔ تو وہ کام جو میں کر سکتا ہوں۔ وہ ہرگز ا[illegible] کر سکتا۔ اور وہ نشان جو مجھ سے ظاہر ہو رہے ہیں وہ ہرگز دکھلا نہ سکتا۔ اور خدا کا فضل اپنے سے زیادہ مجھ پر پاتا۔ جبکہ میں ایسا ہوں تو اب سوچو کہ کیا مرتبہ ہے **اس پاک رسول کا جس کی غلامی کی طرف میں منسوب کیا گیا۔** ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ اس جگہ کوئی حسد اور رشک پیش نہیں جاتا۔ خدا جو چاہے کرے۔ جو اس کے ارادہ کی مخالفت کرتا ہے وہ صرف اپنے مقاصد میں نامراد ہی نہیں بلکہ مر کر جہنم کی راہ لیتا ہے ہلاک ہو گئے وہ جنھوں نے عاجز مخلوق کو خدا بنایا۔ ہلاک ہو گئے وہ جنھوں نے ایک برگزیدہ رسول کو قبول نہ کیا۔ مبارک وہ جس نے مجھے پہچانا۔ میں خدا کی سب راہوں میں سے آخری راہ ہوں۔ اور میں اس کے سب نوروں میں سے آخری نور ہوں۔ بدقسمت ہے وہ **جو مجھے چھوڑتا ہے۔** کیونکہ میرے بغیر سب تاریکی ہے"
(کشتی نوح صہ ۵۶)

خاکسار

ابو العطاء اللہ دتّا جالندھری مولوی فاضل

ملک فضل حسین پبلشر نے اللہ بخش سٹیم پریس قادیان میں باہتمام چوہدری اللہ بخش پرنٹر چھپوایا۔